ہفت روزہ
الفتح
کراچی

”فیروز عبداللہ قاتل جیسے چند مسلمان“

مضمون صفحہ ۲ پر ملاحظہ کیجئے

۱۷ — ۲۴ جون ۱۹۷۱ء قیمت : — ۵۰ پیسے ہوائی ڈاک سے : — ۶۰ پیسے



فیروز عبداللہ کو "سچے مسلمان" کے روپ میں پیش کرنے کی ناپاک جسارت

وقائع نویس

سانحہ ایئرپورٹ کے مجرم فیروز عبداللہ کو ۱۲ر جون کو پھانسی دے دی گئی۔ اُس نے یکم نومبر ۷۰ء کو پولینڈ کے صدر کی آمد کے موقع پر وین سے پولینڈ کے نائب وزیرِ خارجہ اور تین پاکستانیوں کو جن میں دو صحافی شامل ہیں بڑی بے رحمی سے کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔ گرفتاری کے وقت اس نے کہا تھا "میں نے اپنا مشن پورا کر دیا"۔ اس پر خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنائی گئی۔ اس نے صدرِ مملکت سے رحم کی اپیل کی تھی، جو مسترد کر دی گئی۔ اس کا جرم ناقابلِ معافی تھا، اُس نے چار بے گناہ افراد کی زندگی کو اپنے جنون کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اس پر چار افراد کے علاوہ چار خاندانوں کو بے سہارا کرنے کا بھاری جرم بھی عائد تھا۔

وہ قانون کی نگاہوں میں مجرم تھا اور مجرم ہر حال میں سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ صدرِ مملکت نے بھی اُس کے سنگین جرم ہی کے پیشِ نظر اُس کی رحم کی اپیل مسترد کر دی۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا اُس کی سزا اُسے مل گئی۔ گو اُس کی موت چار بیگناہ افراد کی زندگی واپس نہ لا سکی۔ چار بے سہارا اور مجبور خاندانوں کے افراد کے دِلوں پر اُس نے جو چرکہ لگایا تھا، وہ بھر نہ سکا۔ یاسین مرحوم کے چار یتیم بچّوں کی پیشانی سے یتیمی کا داغ نہ مِٹ سکا بیواؤں کی آنکھوں سے بہے ہوئے آنسوؤں کی قیمت واپس نہ مِل سکی۔ پھر بھی فیروز عبداللہ کی موت نے ثابت کر دیا کہ انسانیت کے مسلمہ اصُولوں کو پامال کرنے والے، مذہب کے نام پر ملک و قوم کے وقار کی دھجیاں اڑانے والے معاشرے کی اعلیٰ قدروں کو اپنے جنون کی اندھی آگ میں جلانے والے بالآخر پکڑ میں آتے ہیں اور اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں۔

فیروز عبدُاللہ چار افراد کا قاتل تھا۔ وہ قانون کا مُجرم اور معاشرے کا دُشمن تھا۔ اُسے جو سزا ملی وہ اُس کے جُرم سے کم تھی لیکن ہمارے یہاں کے بعض اخبارات نے اُس کی موت کی خبر اس انداز میں شائع کی، جیسے وہ اعلیٰ وارفع مقصد کی راہ میں قربان ہونے والا پہلا شہید ہے۔ قومی اخبارات کا یہ رویہ جہاں صحافتی اصولوں کے منافی ہے وہاں فیروز عبداللہ کے جرم سے کم سنگین نہیں۔ وہ پھانسی پانے والے دن کہتا ہے "تین مومن جو میری وجہ سے ہلاک ہوتے تھے، میں انہیں معاف کرتا ہوں، لیکن میں مُشرکوں کو معاف نہیں کروں گا"۔ کیا ایک ایسا شخص جو اس زمین پر "مومنوں" کے علاوہ کسی شخص کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیتا، ہماری کسی ہمدردی کا مستحق ہے۔ اُس نے جو کچھ کہا، کیا عین اسلام ہے؟ کیا اسلام کی تعلیمات یہی ہیں کہ اپنے علاوہ باقی سب لوگوں کا گلا کاٹ دیا جائے، کچل دیا جائے، غارت کر دیا جائے، اگر جواب نفی میں ہے، اور یقیناً ہے، کیونکہ اسلام انصاف کا نام ہے۔ محبت و اخوت کا نام ہے۔ اخلاق و مساوات کا نام ہے، تو پھر کراچی سے نکلنے والا اخبار "جسارت" قابلِ گرفت ہے۔ فیروز عبداللہ سے متعلق خبریں اور اداریہ قابلِ اعتراض ہی نہیں، فوجی عدالت اور صدرِ مملکت کے فیصلے اور توثیق کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ روزنامہ جسارت نے ۱۴ر جون ۱۹۷۱ء کے پہلے اداریہ میں ایک مجرم کے گناہ پر پردہ ڈال کر اُسے عوام کے سامنے ایک "سچّے "مسلمان" اور مومن کی صُورت میں پیش کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ اگر اس اندازِ فکر کی ابھی سے حوصلہ شکنی نہ کی گئی تو ممکن ہے ہر سر پھرا مذہب کے نام پر دُوسروں کا گلا کاٹنا شروع کر دے اور پھانسی کے دن یہ کہے کہ "میں نے جو کچھ کیا آخرت کی سرخروئی کے لئے کیا"۔ اگر مذہبی جنُون میں مبتلا پاگل لوگوں نے اسی طرح انسانوں کو ذبح کر کے جنت کی خریداری کا سلسلہ شروع کر دیا تو پھر شاید یہ مُلک انسانوں کا ملک نہ رہے بلکہ وحشیوں اور حیوانوں کا ایک مسکن بن جائے۔ جہاں وحشت اور بربریت کا نام قانون ہوگا۔

اگر اس اندازِ فکر کی حوصلہ شکنی
نہ کی گئی تو ممکن ہے ہر سر پھرا
مذہب کے نام پر دُوسروں کا
گلا کاٹنا شروع کر دے

روزنامہ جسارت نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے:۔

"جلاد نے رسّی کا پھندہ کھینچ لیا اور فیروز عبداللہ ایک جیتا جاگتا وجُود۔ جسدِ بے جان میں تبدیل ہو گیا"۔

آگے چل کر لکھا جاتا ہے:

"اس کی درخواستِ رحم صدرِ مملکت نے نامنظور کر دی تھی۔ وہ اُسے منظور بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تین پاکستانیوں کے علاوہ ہمارے ایک معزز مہمان پولینڈ کے وزیرِ خارجہ کا بھی وہ قاتل تھا۔ اس لحاظ سے فیروز عبداللہ کا پھانسی پانا قانونی تقاضوں کے عین مطابق تھا"۔

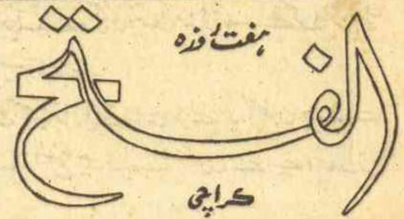
آپ نے ان سطور میں مضمر کا پہلو دیکھ لیا ہوگا۔ یعنی فیروز عبداللہ کی موت کی سزا قانونی تقاضوں کے عین مطابق اس لئے تھی کہ اُس نے پولینڈ کے وزیرِ خارجہ کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اگر معزز مہمان اُس کی زد میں نہ آتے تو ممکن تھا کہ اُس کی رحم کی درخواست منظور کر لی جاتی۔ آگے چل کر اداریہ نویس اپنے اصل مقصد پر آتا ہے۔ جو سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصّہ ہے۔

"تاہم اُس کا جرم کتنا ہی بھاری سہی، وہ بہر حال ایک مسلمان تھا، اور سچّا مسلمان، یہ صحیح ہے کہ ذہنی عدم توازن کی وجہ سے وہ ایسی حرکت کر بیٹھا کہ پھانسی کا پھندہ اس کا مقدّر بن گیا"۔

آپ نے غور فرمایا، سقہ بند اداریہ نویس نے

باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمایئے

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان



کراچی

جلد :— ۲ شمارہ :— ۵

۱۷ — ۲۴ جون ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صدیقی — محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی

ابراہیم جلیس — منہاج برنا

افضل صدیقی — ایم کے جنجوعہ

نائب مدیران

وہاب صدیقی - اشرف شاد - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر:- غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:-	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت — ۶۰ فلس
دوبئی، قطر — ۷۵ درہم
سعودی عرب — ۱۵ قرش
انگلستان — ہاشلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت

دفتر ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی - ای - سی - ایچ - ایس - کراچی — ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ - مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد، کراچی

اداریہ

مُلک دُشمنوں کو پہچانیئے

کرنسی نوٹوں کی تنسیخ اور واپسی، موجودہ نظام میں ایک ایسا اقدام تھا جسے غنیمت شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے وہ بات کُھل کر سامنے آگئی ہے جس کے لئے ہم ایک عرصے سے آواز بلند کر رہے ہیں کہ سرمایہ دار طبقہ ہرگز ہرگز اس ملک کا بہی خواہ نہیں ہے۔ سرمایہ دار طبقے کی ایک ایک حرکت صرف اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے ہے، ملک اور قوم کے مفاد سے اُس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ملک کے لئے جتنی قربانیاں دیں، عوام نے دیں۔ لیکن سرکاری مشینری نے ہمیشہ عوام پر ہی عرصۂ حیات تنگ کیا اور سرمایہ داروں کو ہر قسم کی چھوٹ دیکر عیاشی کا موقع فراہم کیا۔ کرنسی نوٹوں کی تنسیخ کے بعد یہ حقائق سامنے آئے ہیں۔

- سرمایہ داروں نے ناجائز کمائی کے لاکھوں روپے چُھپا رکھے تھے۔
- سرمایہ داروں نے لاکھوں روپے کے سرکاری ٹیکس ادا نہیں کئے تھے۔
- سرمایہ داروں کے بنکوں نے سرمایہ داروں کو قبل از وقت اطلاع دے کر کروڑوں روپے کی رقمیں ڈیپازٹ کرلیں۔
- سرمایہ داروں نے حکومت کو طرح طرح کے جُل دیکر قومی معیشت کو مفلوج کرنے کی مسلسل کوششیں کیں۔

سرمایہ داروں کی اِن ملک دُشمن کارروائیوں کے سامنے آجانے کے بعد اُن سے کوئی رو رعایت قوم سے زیادتی اور فریب کے مترادف ہوگی۔ ان سرمایہ داروں نے اپنے مزدوروں کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اور جائز اضافہ بھی نہیں کیا اور ہمیشہ مالی مشکلات کا رونا رویا۔ لیکن حالات نے ثابت کردیا کہ انھیں کسی مالی مشکل کا سامنا نہ تھا۔ بلکہ قومی معیشت کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا ایک بہانہ تھا، کہ جب چاہیں بحران پیدا کردیں۔ یہ تو ملکی کرنسی کا حال تھا۔ ابھی ان سرمایہ داروں نے غیر ملکی کرنسی میں اپنی بے شمار بلیک منی چُھپا رکھی ہے۔ اس کی بھی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ ایک ایک سرمایہ دار سے ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے۔ سرمایہ داروں کے بیرونِ ملک سفر منسوخ کر دیئے جائیں۔ سرکاری ٹیکسوں کے علاوہ جن کارخانہ داروں نے مزدوروں کی ادائیگیاں روک رکھی ہیں اُن کا بھی فیصلہ کیا جائے۔ ان کی رقمیں روک کر مزدوروں کی واجب الادا رقوم بھی حکومت اپنی نگرانی میں دلوائے۔

ان بنکوں اور احتسابی اداروں کا بھی سختی سے محاسبہ کیا جائے جنھوں نے سرمایہ داروں کو قومی معیشت سے اس طرح کھیلنے کا موقع دیا اور وہ قوم کی اقتصادی حالت کو مفلوج کرتے رہے۔

جناب **افضل صدیقی** کا شمار ملک کے چوٹی کے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ "جنگ" کو دُنیا کا سب سے بڑا اُردو روزنامہ بنانے میں افضل صاحب کا نام سرِفہرست ہے۔ انہوں نے اس اخبار میں چھ سال تک نیوز ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ یہی دور تھا کہ "جنگ" نے ترقی کی انتہائی منزل تک طے کر لی۔ صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال کے دوران انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور یہیں سے جنگ کے زوال کا آغاز ہوتا ہے۔

انہوں نے ۱۹۴۸ء سے صحافتی زندگی کی ابتدا کی۔ امروز، انجام اور جنگ میں اہم ذمہ داریوں کے مستحق قرار پائے۔ اس عرصے میں اُنھیں بہت سے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ خبروں کو کس طرح اور کس کی ہدایت پر کیا سے کیا بنایا۔ یہ ایک سربستہ راز تھا۔ وہ الفتح میں ذیل کے مضمون سے اپنے اس راز سے پردہ اُٹھا رہے ہیں ——— ادارہ

وہ عوام میں اخبار کے ذریعہ اپنا امیج بنانا چاہتے تھے

افضل صدیقی

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب لاہور سے روزنامہ امروز نیا نیا نکلا تھا۔ اور اُس نے اردو صحافت کی بالکل نئی طرح ڈال کر ایک انقلاب سا پیدا کر دیا تھا۔ انقلاب احسان، نوائے وقت، زمیندار اور دُوسرے پرچے اس سے شدید متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے اور انھوں نے بھی ہوا کا رُخ دیکھ کر نئی ڈگر اختیار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ "امروز" میاں افتخار الدین نے نکالا تھا۔ انھوں نے پروگریسیو لمیٹڈ کے نام سے ایک ایسے اشاعتی ادارے کی داغ بیل ڈالی تھی جس کا مقصد صحت مند انقلابی فکر کو پروان چڑھانا اور ترقی پسند ادب و صحافت کو فروغ دینا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز اور ادبی ہفت روزہ لیل و نہار اور کھیلوں کا پرچہ اسپورٹس ٹائمز (انگریزی) بھی شائع ہوتے۔ ایوب خاں کے مارشل لاء کے تیسرے سال ہی اس ادارے کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور اب تک اس کا انتظام حکومت ہی کی نگرانی میں چلا آتا ہے

میں جس زمانہ کی بات کر رہا ہُوں وہ امروز کے دورِ اشاعت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس وقت اس کے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت ہُوا کرتے تھے، اور نیوز ایڈیٹر تھے ایوب کرمانی جو بعد میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ میں شامل ہُوئے اور جن کا انتقال کراچی میں ایک بلند و بالا عمارت کے گرنے کے باعث ہُوا۔

مولانا چراغ حسن حسرت کی وجہ سے یونیورسٹی سے فارغ ہونے والے نوجوان جنھیں ادب و شعر کا چسکا تھا امروز کی طرف راغب ہو رہے تھے یا تو صحافت کا آغاز امروز سے کر رہے تھے یا اس کے لئے نظمیں اور مضامین لکھتے تھے۔ امروز ہی نے اتوار کے خصوصی ایڈیشن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور ادبی اشاعتِ خاص کے نام سے چار صفحے افسانوں، نظموں، غزلوں، مقالوں کے لئے مخصوص ہُوتے تھے۔ یہی چلن بعد میں تمام اخباروں کے لئے قابلِ تقلید بن گیا۔ اور اب تو جمعہ ایڈیشن اور فلمی ایڈیشن وغیرہ بھی نکلتے ہیں۔ امروز ہی نے سب سے پہلے دلچسپ اور خاص انتہائی دلچسپ خبر کو الگ چوکھٹے میں شائع کرنے کی ابتدا کی۔ اس سے قبل کسی اخبار میں بکس یا چوکھٹا دیکھنے میں نہ آتا تھا اس کے علاوہ خاص خبروں یا نمایاں خبروں کی سرخیوں کو خطِ نسخ میں چھاپنے کی ابتداء بھی امروز ہی نے کی۔ یہ ایسی انقلابی جدت تھی جو عام طور پر پسند کی گئی اور اسی وجہ سے دُوسرے اخبار بھی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا۔ اور پاکستان میں اردو صحافت گھٹنوں چل رہی تھی۔ زمیندار کا وہ بھرم اُٹھتا جا رہا تھا جو مولانا ظفر علی خاں نے اپنی بے باکی اور حق گوئی سے قائم کیا تھا۔ اُس زمانے میں امروز کے میگزین ایڈیٹر شعیب حزیں ہُوا کرتے تھے۔ (وہ آجکل ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں، اور بہت ضعیف ہو چکے ہیں) میرے اُن سے مراسم دہلی سے چلے آتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں میں سرکاری ملازمت چھوڑ چکا تھا اور کسی ایسی ملازمت کی تلاش میں تھا جس سے میری تخلیقی صلاحیتیں بھی کام آسکیں، اور جہاں میری انا پسند طبیعت بھی سکون پا سکے۔ اس زمانے میں غزلیں بہت زور شور سے کہہ رہا تھا۔ بیکار جو تھا۔ ایک غزل اور ایک نظم "دلی کا سہاگ" روزنامہ انقلاب (مولانا عبد المجید سالک ایڈیٹر تھے) میں چھپ چکی تھی۔ شعیب حزیں نے مجھ سے کہا کہ تم ایسا کرو، اپنی ایک غزل مجھے دے دو سنڈے ایڈیشن کے لئے۔ اسی کے ذریعے میں تمہارا تعارف مولانا حسرت سے کرا دوں گا۔ مضامین نظم و نثر حسرت صاحب کو دکھائے بغیر چھپ نہیں سکتے تھے۔ میں نے غزل دینے کو تو شعیب حزیں کو دے دی مگر دھڑکا یہی لگا رہا کہ مولانا شعر کے معاملے میں اکل کھرے آدمی ہیں، غزل پھاڑ مروڑ کر پھینک دیں گے۔ خیر انھوں نے پھاڑ کر تو نہیں پھینکی لیکن یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ انھوں نے پسند بھی کی یا نہیں، لیکن وہ غزل امروز کی ادبی اشاعتِ خاص میں چھپ گئی اور ایک ہفتہ کے بعد اس کے معاوضہ کے طور پر دس روپے بھی مجھے مل گئے اس زمانے میں امروز ہی وہ واحد اخبار تھا جو مضمون نگاروں اور شاعروں کو ان کی تخلیقات کی اشاعت پر باقاعدگی سے معاوضہ بھی دیتا تھا۔ غزل کا معاوضہ دس ہی روپے تھا، خواہ سینئر شاعر کی چھپے یا جونیئر شاعر کی۔ نظم کے پندرہ اور بیس روپے ملتے تھے، مضامین پر آٹھ روپے کالم کے حساب سے معاوضہ دیا جاتا تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غزل کا معاوضہ بہت تھا۔ کیوں کہ غزل زیادہ سے زیادہ پاؤ کالم میں سما جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میری غزل نے آدھے کالم کی جگہ گھیری تھی، اور اُس کی کتابت جلی قلم سے ہوئی تھی۔ مجھے اس غزل کا مطلع یاد رہ گیا ہے ؎

لبوں تک نہ آسکے جو فسانہ ہائے جمیل
نگاہِ شوق بیاں کر گئی وہ بالتفصیل

خیر صاحب یہ غزل حسرت صاحب سے تعارف کا بہانہ

باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ کیجئے

مشرقی پاکستان میں کیا ہوا؟ (۳)

عوامی تحریک۔ عوام دشمن سازش بن گئی

ریڈیو بنگلہ دیش مجیب کی تقریر صبح ۸½ بجے نشر کریگا

(پیپل کی خبر)

۱۱ مارچ کو دنیا کی آٹھویں بڑی مملکت کے قیام

محمود شام

گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں مارچ کا مہینہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ شیخ مجیب کی نام نہاد تحریکِ عدمِ تعاون۔ اپنا سوانگ رفتہ رفتہ اتار کر اصلی روپ میں سامنے آ رہی ہے۔ مغربی پاکستان کی نگاہیں مشرقی پاکستان کی طرف ہیں۔ ایک دنیا ڈھاکے میں بدلتے ہوئے حالات کی جانب نگراں ہیں۔ پاکستان کی دشمن طاقتیں سوچ رہی ہیں کہ پاکستان کب تک رہے گا؟ چین کا دوست پاکستان۔ اب اپنی تمام تر چین دوستی اور امریکہ دشمنی کے باعث نیچے آگریگا۔

یہ مارچ کی پانچ تاریخ ہے۔

"پیپل" کی سرخیاں ملاحظہ ہوں

"نجات کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے تیار رہیئے"۔ (مجیب کی "بنگالیوں" سے اپیل)

"صرف انتہائی قربانیوں سے ہی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے"

اسی شمارے میں آخری صفحہ پر ایک تصویر دی گئی ہے، جس کا کیپشن یہ ہے۔

چھاؤنی جانے والی سڑک کے راستے میں عوام نے رکاوٹیں ڈال دیں۔

مولانا بھاشانی نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا اور اعلانِ جنگ کر دیا۔

"قراردادِ لاہور پر عمل در آمد کیجئے ورنہ ہم ہتھیاروں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھالیں گے"

اب اس وقت قائم شدہ متوازی حکومت کی سرکاری پارٹی کے ترجمان، اس اخبار کی "معلومات" کا اندازہ لگا یئے کہ ۵ مارچ کو اس نے صدرِ پاکستان کی ڈھاکہ میں آمد کی خبر چھاپ دی۔ ملاحظہ ہو۔

"صدر ڈھاکہ میں"

اس اخبار میں پہنچنے والی ایک رپورٹ کے مطابق صدر یحییٰ آج ڈھاکہ میں موجود ہیں۔ ڈھاکے میں صدر کی یہ موجودگی اور ہمارے اپنی قسمت کے فیصلہ کرنے کے آخری لمحے یعنی ۷ مارچ سے صرف دو روز قبل انتہائی معنی خیز ہے"۔

یہ اس اخبار کی ہمہ دانی ہے کہ صدر کی ڈھاکے میں موجودگی کی خبر اتنے اعتماد سے چھاپ دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شائع شدہ دوسری خبریں کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں۔ ایسی ہی ایک خبر ملاحظہ ہو۔

"مجیب کا گھر

سرکاری

طاقت کا

حقیقی قلعہ"

(پیپل)

۶ مارچ ۔ شہ سرخی ملاحظہ ہو۔

تمام سرکاری، انتظامی، احتسابی اداروں اور ذرائع مواصلات پر مجیب کا کنٹرول

دوسرے تمام لازمی شعبے بھی اس کی کمان میں ہیں۔

اس سے آگے، ۷ مارچ کا دن آتا ہے، جسے اس اخبار نے عوام کے سامنے فیصلہ کن اور تاریخی دن کے طور پر پیش کیا تھا۔ ۷ مارچ کے لئے بی بی سی، وائس آف امریکہ نے آل انڈیا ریڈیو سے ہم زبان ہو کر یہ اعلان کر دیا تھا کہ ۷ کو شیخ مجیب الرحمٰن یکطرفہ اعلانِ آزادی کرنے والے ہیں۔ اس روز لوگوں کے چہروں پر صبح سے ہی خوف و ہراس طاری تھا۔ ہڑتال کی وجہ سے اور فسادات کے باعث امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ عوام خوفزدہ تھے۔ عوامی لیگ کے رضاکار چھ ستاروں والی ٹوپیاں پہن کر جس سے چاہتے اور جتنا چاہتے چندہ وصول کر لیتے۔ لڑکیاں اٹھالاتے۔ اس خوف و ہراس سے متوسط طبقہ فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اکثر نام نہاد طالب علم لیڈر اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یونیورسٹی کے تمام ہوسٹل اور کینٹینوں کی دیواریں "بنگلہ دیش شادین کرو" (بنگلہ دیش آزاد کرو) کے پوسٹروں سے بھرے تھے۔ متوسط طبقے کی نمائندگی یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ، ابھرتا ہوا تاجر طبقہ، فلم آرٹسٹ اور نوکر شاہی کر رہی تھی۔ وہ یک زبان ہو کر "بنگلہ دیش آزاد کرو" کے لئے دستخط کر رہے تھے۔ نغمے گا رہے تھے۔ اس سلسلے میں ۷ مارچ کو اخبار میں خبر شائع ہوئی۔

"آرٹسٹوں اور صحافیوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک سے اپنے اتحاد کا اعلان کر دیا"۔

قراردادِ لاہور پر عمل - ورنہ ہتھیاروں کے مقابلے میں ہتھیار (بھاشانی کا اعلانِ جنگ)

دستخط کرنے والوں کے نام یہ تھے ۔ خان عطاالرحمٰن حسن امام، انور حسین، رزاق، مسز بیلا ارجمند بانو، بیگم صوفیہ کمال، علی اشرف، کمال لوہانی، علی طارق۔ ۷ مارچ کا فیصلہ کن دن۔ آزادی کا اعلان ہوئے بغیر گزر گیا۔ مجیب صاحب نے صرف چار مطالبات پیش کئے۔ کہتا ہے کہ اس مسئلے میں عوامی لیگ کی ہائی کمان میں آپس میں ٹھن گئی تھی۔ اور وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ ۷ مارچ کو مجیب کی تقریر کے لئے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ نے یہ انتظام کیا تھا کہ اُسے براہِ راست ریلے کیا جائے۔ لیکن مارشل لاء حکام نے اس پر سختی سے پابندی لگا دی۔ اس کے بعد ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن میں بم کا دھماکہ ہو گیا۔ اس کی خبر جو "پیپل" میں ۸ مارچ کو چھپی اُس میں اقرار کیا گیا تھا کہ چونکہ مجیب کی تقریر نشر کرنے پر اچانک پابندی لگا دی گئی تھی، اس لئے اس کے نتیجے میں یہ اقدام کیا گیا۔"

ایک اور خبر دیکھئے جس میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کو یک جنبشِ قلم ریڈیو بنگلہ دیش بنا دیا گیا ہے۔

"ریڈیو بنگلہ دیش آج صبح ساڑھے آٹھ بجے مجیب کی تقریر نشر کرے گا۔"

۱۰ مارچ

"مجیب کا گھر۔ سرکاری طاقت کا حقیقی قلعہ"

ریڈیو بنگلہ دیش نے سمندر پار کے لئے بلیٹن شروع کر دیا۔

اعلان

الفتح کے پہلے سائز کا نیوز پرنٹ مارکیٹ سے بالکل غائب ہے لہٰذا کاغذ کی اس قلت کے باعث ہمیں الفتح کا سائز کچھ مختصر کرنا پڑا ہے جس کے لئے ہم الفتح کے مستقل قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ امید ہے وہ ہماری مجبوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم سے تعاون کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

(ادارہ)

۱۱ مارچ

بنگلہ بندھو کا بیان ۔ آخر دم تک جنگ

"عوام دشمن قوتوں کے نام نہاد اقتدارات بے نقاب ہو گئے ہیں لیکن شرانگیز سازشیں جاری ہیں۔ دشمن بنگلہ دیش میں قتلِ عام کے لئے ہتھیار بندی کئے جا رہا ہے۔"

شیخ مجیب نے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور دنیا بھر کے تمام حریت پسند لوگوں کی اس سازش کی طرف توجہ دلائی جس کی بنیاد اُن کی قوم کے خلاف مسلح جارحیت پر ہے۔"

اس شمارے کے خصوصی اداریئے کے تیور بھی ملاحظہ ہوں جو پہلے صفحہ پر چھپا ہے۔

"بنگلہ دیش میں ایک نئی قوم پیدا ہو گئی ہے"

ایک قوم - ایک ریاست کے لئے جن معروضی شرائط کی ضرورت ہوتی ہے وہ موجود ہیں۔ یعنی علاقائی وحدت، مشترکہ زبان، ثقافت، مطلق اختیارات کی تعمیل کے لئے ایک بے لوث قیادت کے ساتھ موثر سیاسی تنظیم۔ اس لئے بنگالیوں کی موجودہ نسل کا یہ حق اور اختیار ہے کہ وہ ایک لیڈر کے پیچھے ایک چٹان کی طرح متحد ہو جائیں تاکہ دنیا میں آٹھویں بڑی مملکت قائم کرنے میں مدد ملے۔ اور ساڑھے سات کروڑ عوام کے دلوں میں آزادی اور حریت کی آگ جلا دیں ۔ یہ ان کا اشرف ترین مقصد ہے جس کے لئے اعلیٰ ترین خلوص اور آمادگی کی ضرورت ہے۔

"پیپل نے یوں اپنے اداریئے میں ۱۱ مارچ کو آزاد مملکت بنگلہ دیش قائم کر دی تھی ۔ اسی مقالہ خصوصی کے اور تیور دیکھیں۔

"ان رہنماؤں کی تصویریں بھی اب کسی عام مقام پر نظر نہیں آتی ہیں جنھوں نے غیر بنگالی تاجروں، اور جاگیرداروں کے گروپ سے مل کر شیرِ بنگال فضل الحق، سہروردی اور عبدالہاشم جیسے بنگالی رہنماؤں کو الگ تھلگ کر دیا اور اقلیت کی مدد سے اکثریت کا استحصال کیا اور جس نے دنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ بنگالیوں کے سامنے اس وقت بولا جب اُس نے کہا کہ قراردادِ لاہور کا مفہوم دو علیحدہ خودمختار، آزاد اور مطلق الاختیار ریاستیں نہیں تھا اور انہوں نے ٹائپ کی غلطیوں کا بہانہ بنایا۔

بنگلہ دیش کی مقدس سرزمین سے عیاری، استحصال اور دباؤ کے تمام نشانات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دیئے گئے ہیں۔"

یہ تو بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم کے بارے میں "پیپل" کی شر بیانی تھی۔ پاکستان کی مسلح افواج کے بارے میں بھی "گوہر افشانی" ملاحظہ ہو۔

"اپنی تنہائی میں، مغربی پاکستان کی زر خرید افواج آزاد عوام میں محصور، مقبوضہ افواج بن کر رہ گئی ہیں مفاد پرستوں کے کفن میں آخری کیل ٹھونک دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قائد نے کہہ دیا ہے کہ عوام کی جد و جہد اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک بنگلہ دیش کی سرزمین سے آخری زر خرید فوجی بھی رخصت نہیں ہو جاتا۔ یہ مارچ اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ کھلی ہوئی سرزمین تعمیرِ نو کے بعد ہر شخص کے خواب کے مطابق "سنہرا بنگال" نہ بن جائے۔"

۱۱ مارچ تک "پیپل" عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں اس حد تک چلا گیا تھا - ان ساری خبروں، اداریوں یا تقریروں میں کہیں کسی ایسے مغربی پاکستانی سرمایہ دار کے خلاف ایک حرف نہیں ہے - جو مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر مغربی پاکستان کے عوام کی طرح مشرقی پاکستان کے عوام کا بھی استحصال کر رہے تھے۔ ان سارے واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ دار طبقے سے اس تحریک کو کتنا لگاؤ تھا۔ خواہ وہ مغربی پاکستانی تھا یا مشرقی پاکستانی۔ بعد میں مضمون کی ترتیب کے مطابق یہ ذکر تو آئیگا ہی کہ مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں نے اس تحریک کو سینچنے اور جاری رکھنے کے لئے کس طرح سرمایہ فراہم کیا۔

اب آئندہ ہفتے ملاحظہ کیجئے

۱ - صدر یحییٰ کی حکومت اور برطانوی سامراج میں مماثلت ——— (پیپل کا اداریہ)
۲ - چاٹگانگ میں مزدوروں کا جہاز سے مغربی پاکستانی اسلحہ اتارنے سے انکار (پی پی آئی کی خبر)
۳ - امریکی نقلِ مکانی نہیں کر رہے (پیپل کی خوشخبری)
۴ - ولی خان کا اعلانِ حمایت
۵ - چیک پوسٹوں کا قیام

۱۹۶۵ء میں عوام نے ایک پیسہ ایک ٹینک کے جذبے کے تحت قربانیاں دیں — مگر

اپوا کالج نے حکومت سے ساڑھے باون ہزار روپے کا فراڈ کیا

اشرف شاد

آج سے چھ سال قبل ۱۹۶۵ء میں پاکستان نے ایک بہت بڑے قومی بحران کا سامنا کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بھارتی توسیع پسندوں نے پاک سرحدوں کا رُخ کیا تھا، اور جس کے نتیجے میں ایک طویل معرکہ آرائی کے بعد اُسے پسپائی ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ عوام ایک پیسہ ایک ٹینک کی مہم چلا رہے تھے۔ دفاعی اخراجات سے نمٹنے کے لئے ایک ایک پائی دانتوں سے پکڑی جا رہی تھی لیکن اسی دوران میں ایک بہت بڑا فلاحی ادارہ ایسا بھی تھا جو جعلی دستاویزات کے ذریعے حکومت کے ساتھ فراڈ کر کے اُس سے ہزاروں روپے کی امداد بٹور رہا تھا۔

یہ ایک بھیانک جرم تھا جو اس ادارے کے نامۂ اعمال میں آج بھی تحریر ہے اور اُس کے ساتھ ہی حکومت کی فائلوں میں بھی محفوظ ہے، لیکن یہ ادارہ آج بھی پہلے کی سی سرخروئی کے ساتھ اپنی فلاحی سرگرمیاں جاری رکھے ہُوئے ہے۔

یہ شہرۂ آفاق ادارہ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن (اپوا) ہے جو خواتین کی سربلندی کا پرچم اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہُوئے ہے۔ جسے پاکستان میں امریکی دُودھ پلانے اور گندم کھلانے کی اجارہ داری حاصل ہے۔ جو آرائشِ گیسو سے لے کر پکوان کی تیاری تک کے مظاہروں کا اہتمام کرتی ہے۔ اور بڑے بڑے صاحبانِ اختیار کی بیگمات جس کا دسترخوان سجاتی ہیں۔ لیکن اس نے اصلاح کا پرچم کِس خلوص اور دیانت سے اُٹھائے رکھا ہے اس کا اندازہ ان بہت سی کہانیوں سے ہو سکتا ہے جو اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ ان میں سے ۱۹۶۵ء کے زمانے کی ایک کہانی بھی ہے جو سُنی سنائی نہیں، بلکہ لکھی لکھائی اور مصدقہ کہانی ہے۔

حال ہی میں اس عظیم فلاحی ادارے کو ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے اور اس کے توسط سے ملنے والی غیر ملکی امداد کے تحت قائم ہونے والے ہوم اکنامکس کالج کے اختیارات اب اس کے ہاتھوں سے نکل کر براہِ راست حکومت کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں۔ تاہم اس ایک کالج کے علاوہ بھی تعلیمی اداروں کی ایک بڑی زنجیر اپوا سے منسلک ہے۔ ۱۹۶۵ء میں حکومت سے ہزاروں روپے کے فراڈ کی اس کہانی نے انھیں میں سے ایک تعلیمی ادارے میں جنم لیا تھا۔

حکومت کے ساتھ اپوا کا فراڈ

۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک کے ہنگامی سالوں میں اپوا کی انتظامیہ نے اپواء کالج کے اساتذہ کی تنخواہوں کے بارے میں جعلی اور بوگس دستاویزات تیار کر کے تقریباً ۵۲ ہزار روپے کے غلط حسابات پیش کئے اور اس کے عوض ۳۱ ہزار روپے سے زائد کی امداد وصول کر لی۔ دوسری طرف اساتذہ سے زبردستی زیادہ رقموں پر دستخط وصول کئے اور وہ تنخواہ انہیں ادا نہیں کی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کہ محکمہ تعلیمات نے ایک سرکلر نمبر ایڈمن (۱)/۲۴۵۱ - ۵۰۰۰ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۴ء کے تحت تمام غیر سرکاری کالجوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کالجوں میں سرکاری کالجوں کے اسکیل نافذ کرائیں۔ غیر سرکاری کالجوں کی ایک بڑی تعداد نے اس سرکاری حکم پر عمل درآمد کیا لیکن اپواء کالج نے اس کی جانب جون ۱۹۶۵ء میں توجہ دینے کی زحمت کی۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں جون کی جو تنخواہ عملے کو دی گئی وہ نئے اسکیل کے مطابق تھی۔ اس مہینے میں عملے کی تنخواہوں پر کل ۱۲ ہزار ۴ سو ۷۵ روپے کے اخراجات آئے۔

جون ۱۹۶۵ء کے بعد جولائی میں اپواء کی انتظامیہ اچانک حاتم طائی بن گئی اور اُس نے عملے کی تنخواہوں میں ایک دم ۲۵ فیصد کے مزید اضافے کا اعلان کیا۔ اس لئے اضافے کے ساتھ ہی تنخواہوں کے نئے رجسٹر پر نیا کھاتہ کھولا۔ جس میں جولائی ۱۹۶۵ء سے نئی اضافہ شدہ تنخواہیں درج کی گئیں۔ اس رجسٹر پر چسپاں ریونیو ٹکٹ پر عملے سے نئی تنخواہوں کی وصولیابی کے دستخط کرائے جاتے رہے۔ یہ سلسلہ ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۶۶ء کے سالوں میں اسی طرح جاری رہا۔ اور ہر ماہ ۱۴ ہزار ۹ سو ۳۲ روپے ۵۰ پیسے کی ادائیگی عمل میں آتی رہی

تنخواہوں میں ۲۵ فیصد کے اس اضافہ کی حیثیت محض کاغذی تھی۔ اور یہ اضافہ صرف سرکاری امداد بٹورنے کے لئے ظاہر کیا گیا تھا۔

جون ۱۹۶۵ء میں عملے کو سرکاری اسکیل کے مطابق تنخواہیں ادا کی گئی تھیں۔ اور جولائی ۶۵ء کے ماہ میں تقسیم ہونے والی ان تنخواہوں کی وصولیابی کے دستخط تنخواہوں کے پرانے رجسٹر میں حاصل کئے گئے تھے۔ لیکن جب انتظامیہ نے جون ہی سے ۲۵ فیصد کا مزید اضافہ کیا تو اُسے اس طرح تنخواہ میں بڑھنے والی رقم کا ایک سپلیمنٹری بل بنا کر اُن پر باقی رقم ادا کرنی چاہیے تھی لیکن اس کے لئے ایک نیا رجسٹر تیار کیا گیا۔ اور اس پر جون ۱۹۶۵ء کی تنخواہوں کا نئے سرے سے اندراج کر کے عملے کے دستخط حاصل کئے گئے جب کہ قاعدے کی رُو سے ایک مرتبہ حکومت کے منظور شدہ اسکیل پر جب ایک رجسٹر پر تنخواہوں کی ادائیگی عمل میں آ جاتی ہے تو وہ دُوسرے رجسٹر پر دوبارہ اپنی تنخواہیں وصول نہیں کر سکتے۔ مگر یہ رجسٹر دیکھنے کے بعد کہیں بھی اس دوسری ادائیگی کا اندراج نہیں ملتا۔

آڈٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ تنخواہوں کا

خواتین کی کُل پاکستان تنظیم کے چہرے پر بد دیانتی کا دھبّہ نمایاں نظر آتا ہے

نیا رجسٹر ایک جعلی دستاویز ہے جس پر زیادہ سرکاری امداد وصول کرنے کے لئے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافے کے نام پر بوگس اخراجات دکھائے گئے۔ اور اساتذہ کو بڑھی ہوئی تنخواہ ادا کئے بغیر اُن سے دستخط حاصل کئے گئے۔ آڈٹ نے اس سلسلے میں ایک اور واضح ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ سرکاری حلقوں کے مطابق عملے کی تنخواہوں میں سے ۶¼ فیصد کے حساب سے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کٹتی ہے۔ عملے کی تنخواہوں میں ۲۵ فیصد اضافے کے بعد پراویڈنٹ فنڈ بھی اسی حساب سے کٹنا چاہیئے تھا۔ لیکن ۲۵ فیصد اضافے کے بعد بھی پراویڈنٹ فنڈ پرانی شرح کے حساب سے ہی کٹتا رہا۔ مثلاً کالج کی پرنسپل مسز مسعودہ جاوید ۶۵-۱۹۶۴ء میں جب ۶۴۰ روپے ماہوار تنخواہ پا رہی تھیں، ان کی تنخواہ سے ۴۰ روپے پراویڈنٹ فنڈ کے کٹتے تھے، جون ۱۹۶۵ء میں تنخواہوں کے سرکاری اسکیل متعین ہونے کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کی نئی شرح کے ساتھ ۵۷ روپے ۸۰ پیسے کے حساب سے کاٹا گیا۔ جب اسی ماہ انتظامیہ نے اپنی طرف سے تنخواہوں میں ۲۵ فیصد اضافے کا اعلان کیا تو اُن کی تنخواہ ایک ہزار ایک سو ۶۵ روپے ۲۵ پیسے ہو گئی۔ پراویڈنٹ فنڈ اس کے بعد بھی تنخواہ کے پچھلے اسکیل کے مطابق ۵۷ روپے ۸۰ پیسے کے حساب سے ہی کٹتا رہا۔ جب کہ نئی تنخواہ کے مطابق فنڈ ۷۲ روپے ۲۶ پیسے کے حساب سے کٹنا چاہیے تھا۔

۶۷-۱۹۶۶ء میں مسز مسعودہ جاوید کو ایک انکریمینٹ ملا اور اُن کی اصل تنخواہ (انتظامیہ کے کاغذی اضافے سے قبل کی) ۹۲۵ سے بڑھ کر /۱۰۰۰ روپے ماہوار ہو گئی۔ اسی حساب سے ان کی تنخواہ سے ۶¼ فیصد جو فنڈ کاٹا گیا وہ ۶۲ روپے پچاس پیسے کے حساب ہی سے کٹنا دکھایا گیا ہے لیکن رجسٹروں میں تنخواہ کا اندراج ۲۵ فیصد کے بوگس اضافے کے مطابق ۱۲ سو ۵۰ روپے ہی درج کیا گیا۔

اسی طرح دُوسرے لیکچررز کے ساتھ ہوا۔ مثلاً مس نسیمہ اوصاف اور مسٹر ڈی اے غازی کو سرکاری اسکیل کے مطابق درحقیقت ۴۹۰ روپے ماہانہ ادا کئے گئے لیکن ۲۵ فیصد کے بوگس اضافے کے تحت ان کی تنخواہیں ۶۱۲ روپے ۵۰ پیسے ظاہر کی گئیں۔ جب کہ پراویڈنٹ فنڈ اصل تنخواہ کے مطابق ہی کاٹا گیا۔

آڈٹ کے دوران میں پرنسپل سے تنخواہوں میں ۲۵ فیصد کے اضافہ کا حکم نامہ دکھانے کو کہا گیا تھا۔ لیکن ایسا کوئی حکم نامہ پیش نہ کیا جا سکا۔

۶۶-۱۹۶۵ء میں کچھ لیکچرز اور کلرک ملازمت پر لئے گئے تھے۔ تقرری کے احکامات کے تحت انھیں پرانے اسکیل پر رکھا گیا۔ اور ایک ماہ اسی اسکیل کے تحت تنخواہ دی گئی۔ لیکن ایک ماہ بعد ہی ان کی تنخواہوں میں بھی ۲۵ فیصد کا اضافہ عمل میں آ گیا۔ مثلاً مس نسیم رشید اور مس فریدہ خاتون ۴ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو، مس سنجیدہ اختر ۸ اکتوبر ۶۵ء کو بحیثیت جونیئر لیکچرار، محمد شبلی یکم ستمبر ۶۵ء کو لیکچرر، اور محمد عرفان خان ۲۶ اگست ۶۵ء کو کلرک ملازم رکھے گئے۔ تقرری کے پہلے ماہ کے دوران میں انھیں علی الترتیب /۲۷۵ - /۲۷۵ - /۲۵۰ اور /۱۰۰ روپے ادا کئے گئے جب کہ ملازمت کے اگلے ماہ ہی ان کی تنخواہیں ۲۵ فیصد اضافے کے حساب سے ۳۴۳/۷۵، ۳۴۳/۷۵ - ۴۳۷/۵۰ اور ۱۲۵/ روپے کر دی گئیں۔ یہ بھی اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ نئے افراد کو ملازم رکھنے کے بعد رجسٹروں پر ان کی تنخواہیں کس طرح جعلی اضافہ کر کے بڑھا دی گئیں۔ اور ان کی بنیاد پر سرکاری امداد وصول کی گئی۔

آڈٹ کی رپورٹ کے مطابق ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۷-۱۹۶۶ء کے ان سالوں میں اپوا کالج نے یہ بوگس اور جعلی اکاؤنٹس اور دستاویزات پیش کر کے کل ۵۲ ہزار ۶ سو ۰۷ روپے ۵۹ پیسے کا فراڈ کیا۔ اور تنخواہوں میں ۲۵ فیصد اضافے کے نام پر فراڈ کر کے حکومت سے ۳۱ ہزار ایک سو ۷۲ روپے دھوکہ دہی کے ذریعے حاصل کئے۔ ۶۶-۶۵ء اور ۶۷-۶۶ء کا یہ وہ دَور تھا جب کہ پاکستان نے بھارت سے ایک طویل جنگ لڑی تھی اور جس وقت ایک ایک پیسہ پُورے ملک کے لئے ایک ٹینک کے برابر سمجھا جاتا تھا



سندھ جو زندگی (۱)

ٹرانسپورٹ

سجاول — ٹھٹّہ سے کٹ جائے گا

سندھ کے مسائل جاننے کے لئے ہفت روزہ "الفتح" یہ نیا سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ پہلی بار ٹرانسپورٹ کے مسئلے کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ تفصیلی تو نہیں ہے مگر ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں غریب سندھیوں کی مشکلات کا ایک خاکہ پیش کرتا ہے۔ آپ بھی اس سلسلے میں ہماری مدد کریں اور مسائل سے آگاہ کریں یا ہمیں لکھیئے۔ ہمارے نمائندے آپ سے رابطہ قائم کر کے متعلقہ مسائل کا جائزہ لینے کے لئے خود حاضر ہو جائیں گے۔

ارشاد راؤ کے قلم سے

سندھ کے کھیت پیاسے ہیں، دریا کی ریت اُڑ رہی ہے۔ نہریں خشک ہیں۔ مچھلیاں جل کی تلاش میں کانٹے بن گئی ہیں۔ ہاری اُداس ہے، بہت اُداس۔ چاول بونے کا موسم ختم ہو رہا ہے۔

وطنِ عزیز کی اس دھرتی پر چرواہے پریشان ہیں بکریاں خشک ٹہنیوں کو چبا چبا کر دُبلی ہو گئی ہیں۔ چرواہے بڑے حسرت سے سندھ کا مشہور گیت گاتے ہیں "منھجا دیس ملیر" (میرا دیس سرسبز و شاداب ہے)

ایک ہاری سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا "سائیں، ہم زیادہ پریشان نہیں۔ ویسے پریشان ضرور ہے۔ اچھے دن ضرور آئیں گے۔ قدرت امتحان لے رہا ہے۔ یہ ہوتا ہے۔ ہم تو اُس دن کا انتظار کرتا ہے، جب ملک میں "ٹپّر ورایو" والی بات ہو گی۔

ہاری نے ایک نئی بات "ٹپّر ورایو" کہہ دی تھی۔ مطلب پوچھا تو کہنے لگا "ٹبرے کے پاس جو ہے، اُس میں سے چھوٹے کو بھی حصّہ ملے۔ آدھ آدھ کرے۔ سب پاور والا نہ کھا جائے، ہاری کو بھی برابر کا حصّہ ملے "ٹپّر ورایو" کہلاتا ہے۔

وہ کہنے لگا "بھٹّہ سائیں کا پارٹی ہے نا، اس میں ایک سندھی وڈیرا میر رسول بخش ٹالپور ہے۔ سائیں "سُٹھو مانو" ہے۔ غریب کا ہمدرد ہے۔ الیکشن میں ادھر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک "مہاجر وڈیرا" تھا اس "مہاجر وڈیرے" میں بڑا جوش تھا۔ بابا، آگ تھا، آگ، وڈیرے کے سامنے کہتا تھا "ہاری لوگو، یہ وڈیرے تم کو زمین نہیں دیں گے۔ سوشلزم آئے گا تو پھر یہ زمین دے گا۔ ہماری پارٹی زمین دلائے گا۔ وڈیرہ ختم ہو جائے گا۔" میر سائیں نے پھر ہم کو سوشلزم کا معنی بتایا "ٹپّر ورایو"

ہاری، کھیت مزدور اور سندھ کے عوام "ٹپّر ورایو" کے لئے بلاشبہ قربانیاں دے رہے ہیں۔ اس کا علم بھٹّہ صاحب، میر رسول بخش اور "مہاجر وڈیرے" معراج محمد خاں

GOVERNMENT TRANSPORT SERVICE
HYDRABAD Series A
Date
ROAD PASSENGER TICKET
From
To
Fare charge Rs
№ 825475

GOVERNMENT TRANSPORT SERVICE
HYDRABAD Series A
Date
ROAD PASSENGER TICKET
From
charge Rs
№ 590927

KAX 9932 4.00 Paisa — Bashir Tr — 1.80 UpPaisa — 35 Paisa — 2.00 UpPaisa — KAX 9996 — 75 UpPaisa — SBTC — 1-25 Paisa — SBTC — 1-00 Paisa — KAU 9611 — 62 Paisa — № 64954

ان میں پرائیویٹ بسوں کا ایک بھی ٹکٹ اصلی نہیں۔ روڈ ٹرانسپورٹ کے ٹکٹوں کی نقل ملاحظہ کیجیے۔



سندھ پیاسا ہے



کو ہے؟

ہاریوں کی قربانیوں اور ہاریوں کے مسائل کو قریب سے جاننے کے لئے میں نے کراچی سے اندرونِ سندھ کا سفر شروع کیا ہے۔ سب سے پہلے جس مسئلے کا مجھے خود سامنا کرنا پڑا اور جس سے سینکڑوں ہاریوں کا روزانہ واسطہ پڑتا ہے، پہلے اُس کی کہانی سُن لیں۔ ہاریوں کو شہر سے دیہات اور دیہات سے شہر جانے کا بڑا ذریعہ لاریاں ہیں۔ لاریوں اور ہاریوں کے درمیان کتنی مصیبتیں اور تکلیفیں ہیں، اُس کے لئے میں نے پندرہ روز تک کراچی سے گھارو، ساکرو، ٹھٹھہ، سجاول کے درمیان لاریوں کی ہر قسم، یعنی سرکاری، پرائیویٹ بسوں اور کیریئر موٹروں سے سفر کیا۔ اور اپنی آنکھوں وہ تکلیف وہ مناظر دیکھے جن سے بیچارے غریب سندھی ہاریوں کو روزانہ گزرنا پڑتا ہوگا۔

اکثر کیریئر موٹریں لائسنس یافتہ گاڑیاں نہیں ہیں۔ یہ لانڈھی اور گھارو کے درمیان چلتی ہیں۔ ان کا وجود ٹریفک پولیس کے اُس عملے کی مہربانیوں کی وجہ سے ہے جو لانڈھی پر متعین ہوتا ہے۔ ان ذمہ دار سرکاری اہلکاروں کے سامنے گاڑی اس طرح رُک جاتی ہے، جیسے کسی ٹرک میں بھوسہ بھرا جاتا ہے۔ اندازہ لگائیے، ڈرائیور کی سیٹ پر چار مسافر اور اُس کے پیچھے اکیس بائیس مسافر، ڈرائیور کے سر کے اُوپر چھت پر چار پانچ مسافر۔ اور چھ سات لٹک کر سوار ہونے والے ہوتے ہیں۔ ایک مسافر سے گھارو تک ڈیڑھ روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ راستے میں کتنی مقامات پر یہ منظر پولیس کے ملازمین کو دکھائی دیتا ہے لیکن ڈرائیور کے پاس کوئی ایسا جادو ہوتا ہے کہ اُسے پوچھنے والا سمت بدل لیتا ہے

سندھ روڈ ٹرانسپورٹ ایک قومی ادارہ ہے۔ اس روٹ پر تمام بسیں لاوارث گائیں بھینسوں کی طرح رینگتی رہتی ہیں۔ اچھے دنوں میں ان بسوں کے اوقات کی بڑی دھوم تھی۔ اب اوقات کا اِن سے سِرے سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کراچی میں نیشنل بنک کی بلڈنگ کے پاس سے سوار ہو جائیے۔ بکنگ آفس والے ٹکٹ بند کر دیں گے لیکن گاڑی اسٹینڈ پر کھڑی رہے گی۔ جنھوں نے ٹکٹ بکنگ آفس سے نہیں لئے انہیں کنڈکٹر روانگی کے بعد ٹکٹ جاری کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ کمیشن بڑھانے کے لئے ہوتا ہے یہاں سے چلنے کے بعد گاڑی لانڈھی رُکتی ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے سرکاری ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بسوں کا معاہدہ، جونہی سندھ روڈ ٹرانسپورٹ کی بس پہنچتی ہے، پرائیویٹ بس روانہ ہو جاتی ہے۔ یہ اس وقت تک کھڑی رہتی ہے جب تک دُوسری پرائیویٹ بس نہیں آتی۔ اس عمل میں آدھ پون اور بعض اوقات پُورا گھنٹہ تک لگ جاتا ہے۔

ٹریفک قوانین کے مطابق مسافر بسوں میں مقررہ تعداد سے زیادہ سواریاں نہیں بٹھائی جا سکتیں۔ مگر اسے کیا کہیئے کہ پرائیویٹ بسیں تو درکنار سرکاری بسوں کی چھتوں کو مسافروں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون کا احترام اولیت کا مقام رکھتا ہے مگر اس کھلم کھلا خلاف ورزی کی روک تھام نہیں ہوتی۔ حتّٰی کہ ان بسوں میں چیکنگ تک نہیں آتے۔ کنڈکٹر جو ٹکٹ دیتے ہیں وہ نقل ہوتے ہیں۔ اصل ٹکٹوں کو کب استعمال کیا جاتا ہے یا اُن پر کیا رقم درج ہوتی ہے، مسافروں کو کوئی علم نہیں

اس روٹ پر مسافروں کی سہولت کے لئے ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے گھارو کے قریب ایک سب آفس قائم کر رکھا ہے۔ اس کا مصرف کیا ہے، ٹرانسپورٹ کے کرتا دھرتا حضرات کے علم میں ہوگا۔ عام مسافر تو یہی دیکھتا ہے کہ لکڑیوں کا ایک ڈھانچہ موجود ہے۔ اس کے باہر سب آفس سندھ روڈ ٹرانسپورٹ بھی لکھا ہوا ہے مگر اندر سے خالی ہے۔ بڑی کوشش اور بار بار کے چکروں کے باوجود یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے اربابِ اختیار مسافروں کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کر رہے ہیں؟ آخر سفر کے بھی تو کچھ آداب ہوتے ہیں۔

پرائیویٹ بسوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ سرکاری بسیں کم از کم ٹکٹ کی نقل دے کر اصل اپنے پاس رکھ لیتی ہیں لیکن



بس کو مسافروں کی اور مسافروں کو بس کی ضرورت ہے۔

سرکاری ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بسوں کا خفیہ گٹھ جوڑ

پرائیویٹ بسوں میں نقل تو کجا جعلی ٹکٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ لانڈھی سے ٹھٹھہ کے لئے ایک بس جس کا نام "بلبل شہناز" تھا۔ اور ملکیت حاجی صدیق ٹرانسپورٹ بشیر کی تھی۔ جس کا نمبر کے اے زیڈ ۵۰۰۸ درج تھا۔ اس میں کنڈیکٹر نے گلابی رنگ کا ٹکٹ دیا۔ جہاں پر رقم لکھی ہوئی تھی، وہ جگہ پھاڑ کر پھینک دی گئی۔ ٹکٹ کا نمبر ۵۱۹۳ تھا۔ اس سے پہلے ایک اور مسافر کو ۵۱۹۲ بھی اسی طرح تھمادیا گیا اور پونے تین تین روپے وصول کر لئے گئے۔

گھارو پہنچنے پر کنڈکٹر سے عاجزانہ درخواست کی گئی "بھائی ہم ملازم ہیں۔ دفتر کو حساب دینا ہوگا۔ آپ کے پاس ٹکٹ نہیں تو اس کی پشت پر رقم لکھ کر دستخط کر دیجئے"۔ کنڈکٹر معصوم تھا، تاڑ گیا۔ اس نے پہلے والا ٹکٹ واپس مانگا اور اس کے بدلے میں دو ٹکٹ ۴۳۸۰۰ مالیتی دو روپے اور ۹۸۶۷۰ مالیتی ایک روپیہ اسی پیسہ دے دیئے۔ اب معاملہ اُلٹا ہوگیا۔ پونے تین روپے کے بدلے تین روپے اسی پیسے کے ٹکٹ مل گئے۔ کنڈکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا کہ پہلے کیوں پیسے کم لے رہے تھے۔ تو اس نے کہا کہ میں آپ سے مزید پیسے تو نہیں مانگ رہا۔ آپ کو بھی فائدہ ہونا چاہیئے۔ تین روپے اسّی پیسے وصول کیجئے۔ کون پوچھتا ہے۔

اصولاً ٹکٹ ضابطے کے مطابق ہونے چاہئیں لیکن پرائیویٹ بسوں کو ضابطے کی ہرگز پرواہ نہیں۔ ایک بس میں ٹکٹ کی قلت ہوسکتی ہے۔ یہ قلت ایک یا دو دن میں دور کی جاسکتی ہے مگر سارا کاروبار جعلی ہو رہا ہے۔ نوّے فیصد بسوں میں اسی طرح سے ٹکٹ دیتے جاتے ہیں۔

اس کے دو بڑے فائدے ہیں، ایک تو کنڈیکٹر اور ڈرائیور کی ذات سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ دور دراز کے علاقوں میں چلنے والی بسوں میں سفر کرنے والے اکثر ان پڑھ ہوتے ہیں۔ اُن سے مُنہ مانگے پیسے وصول کرلئے جاتے ہیں۔ ٹکٹ پر درج رقم اس لئے پھاڑ دی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ہندسے نہ پڑھنا جانتا ہو۔ یہ معولی سا خطرہ اس طرح ٹل جاتا ہے۔

دوسرا فائدہ مالکان کو ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کمپنی کو زبردست خسارے میں دکھا سکتے ہیں۔ انکم ٹیکس تو ریکارڈ پر لگے گا۔ ظاہر ہے کہ ریکارڈ میں جعلی ٹکٹوں کی فروخت تو درج نہیں ہوگی۔ ہر پھیرے میں دس پندرہ یا پانچ دس اصلی ٹکٹوں کی فروخت دکھادی جاتی ہوگی۔

قومی خزانے کو اتنا بڑا نقصان اور مسافروں کی جیبوں پر دن دہاڑے ہاتھ صاف کرنے کی کھلی چھٹی معمول سے لالچ کی بنا پر ملی ہوئی ہے۔ یہ لالچ کیا ہے۔ اس کا سراغ لگانا بھی مشکل نہیں۔ ہر مہینے کی پہلی، دوسری یا تیسری تاریخ کو کسی پرائیویٹ بس میں سفر کیجئے۔ بڑے اسٹینڈوں پر جونہی بس رُکے گی ایک سفید کپڑوں میں ملبوس، چپل والا انسان کنڈکٹر کے پاس آئیگا۔ کنڈکٹر بڑی خوشی سے اُسے بیس روپے تھمادے گا۔ اور پھر یہ بھی بتائے گا کہ فلاں فلاں اسٹینڈ پر فلاں فلاں صاحب کو وہ ماہانہ ادا کرچکا ہے۔ تیسری تاریخ ہوگی تو وہ اُن لوگوں کے نام بھی بتائے گا جو ملِ نہیں سکے اور جن کی امانت اُس کے پاس محفوظ ہے۔

کنڈیکٹر سے سفید کپڑوں میں ہر ماہ بیس روپے کون وصول کرتا ہے؟

اس قسم کا واقعہ سجاول میں ۳ جون کو دیکھنے میں آیا۔ کراچی آنے والی بس کے کنڈکٹر نے ایک باریش ادھیڑ عمر کے موٹے تازے شخص کو بیس روپے دیئے۔ اُس نے اُن افراد کے نام بھی گنوائے جنھیں وہ "رقم تارہ" چکا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ کون ابھی تک اس نعمت سے محروم ہے۔

کنڈیکٹروں سے سفید کپڑوں میں ہر ماہ کون بیس روپے فی بس وصول کرتا ہے۔ یقیناً ہماری مستعد پولیس کے ذمہ دار افسروں کے نوٹس میں ہوگا۔ لیکن کوئی ایسی مجبوری معلوم ہوتی ہے جس کی بنا پر گرفت نہیں ہورہی

سرکاری اور غیر سرکاری بسوں کے علاوہ لوڈنگ ٹرک بھی مسافر برداری کا کام کرتے ہیں۔ قانوناً یہ جرم ہے مگر اس کا ارتکاب روز افزوں ترقی پر ہے۔ ان کے ڈرائیوروں کی بھی سفید کپڑے والے نامعلوم ٹیکس وصول کرنے والوں سے دوستی ہے، وہ بھی ناکوں پر حسبِ وعدہ مہینے کے مہینے نذرانہ پیش کرتے ہیں

کراچی سے ٹھٹھہ اور ٹھٹھہ سے سجاول کی سڑکیں ناگفتہ بہ حالت کا شکار ہیں۔ گھارو کے نزدیک شفیع آباد سے گوجو کا راستہ، ۲ جون ۷۱ء تک مسافروں کے لئے وبالِ جان بنا ہوا تھا۔ چھ میل کا راستہ بسیں پون گھنٹے میں طے کرتی تھیں اور مسافر گیند کی طرح اُچھلتے تھے۔ خواتین، بچے، بوڑھے اور جوان سبھی "ایک ہی کشتی" میں سوار ہوتے تھے۔ اور اس کے غرق ہونے کا خطرہ ہر لحظہ رہتا تھا۔ ہاڑی پسلی ایک ہوجاتی تھی۔ ۷ جون سے دوسری سڑک کھل گئی ہے اور اب اس پر آمدورفت جاری ہے۔

ٹھٹھہ سے سجاول کا سفر المیہ ہے کہ کسی انتہائی گنہگار شخص کو دنیا میں ہی اُس کے اعمال کی سزا ملنا شروع ہوگئی ہے۔ ٹھٹھہ میں جب اسٹینڈ سے سجاول کو بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ وہ ایک ویران زمین کا ٹکڑا ہے۔ سخت گرمی میں دور دور تک سر چھپانے کے لئے پیڑ بھی نظر نہیں آتے۔ ۴ جون ۷۱ء کو اس بس سٹینڈ پر موجود مسافروں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے ان کا بُرا حال ہورہا تھا۔ کئی ایک چکرا کر گرے اور انھیں بھاگ دوڑ کے بعد تانگوں میں لاد کر قریبی ہوٹل تک پہنچا دیا گیا۔

سجاول کو جانے والی سڑک کا حُلیہ بالکل بگڑ چکا ہے۔ ٹھٹھہ کی چنگی کے نزدیک سڑک زیرِ تعمیر ہے امکان ہے کہ بارشوں کے موسم سے پہلے یہ سڑک مکمل نہیں ہوگی۔ اب جس راستے سے بسیں گزرتی ہیں وہ ایک خشک دریائی نالہ ہے، بارشوں میں یہ بہنے لگے گا اور اس طرح سجاول ٹھٹھہ سے کٹ جائے گا۔

زیتا پوٹس نے امریکہ کو شکست



زیتا پوٹس

زیتا کا مکان جل رہا تھا، خاوند کا دل بیٹھ رہا تھا

نعیم آروی

"جب کبھی میں نا انصافی دیکھتی ہوں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں دولت کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسے بدنصیبوں کی کمی نہیں جو بھوکے سو رہتے ہیں، اور موسلا دھار بارش اور سردی کی کڑکڑاتی راتوں میں اُن کے کپڑوں سے خالی جسم کپکپاتے ہیں۔ میرے اپنے محرومی اور بدنصیبی کے دن یاد آنے لگتے ہیں۔ میں اب بھی خوشحال نہیں ہوں۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں خوشحالی کا سورج نصف النہار تک پہنچ چکا ہے"۔

یہ الفاظ کسی ایسے ملک میں رہنے والی خاتون کے نہیں ہیں، جہاں غربت، افلاس اور معاشی ناانصافیوں کا دَور دَورہ ہو، یہ الفاظ امریکہ جیسے ایک ترقی یافتہ اور دولت مند ملک میں رہنے والی ایک غریب خاتون زیتا پوٹس کے ہیں، جس نے آنکھیں کھولنے کے بعد قدم قدم پر مصائب کا سامنا کیا۔ اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر دن رات محنت کی، اپنے اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کسی کام میں عار محسوس نہ کی۔ اس کے پڑھے لکھے شوہر نے کلبوں اور اسٹوروں میں جھاڑو تک دیا مگر انھیں زندگی کی کئی راتیں بھوک اور بیماری کے جہنم میں جلتے ہوئے گزارنی پڑیں۔

زیتا پوٹس نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا، وہ اپنے شوہر ڈک کے ساتھ ایک تنگ کمرے میں رہتی تھی۔ صبح کو اُٹھ کر وہ دونوں کھیت میں چلے جاتے اور وہاں سے گلے سڑے ٹماٹر چن کر اپنے گھر لاتے، پھر انھیں صاف کر کے پکاتے اور اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھاتے۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر، غلیظ اور بدبودار تھا۔ بڑی تنگی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ گھر کا کرایہ چڑھ گیا۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے طور پر کرایہ ادا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ ویلفیئر سوسائٹیوں سے قرض مانگا مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی اور بالآخر سردیوں کی ایک صبح کو جب ہر آدمی کا دل چاہتا ہے کہ وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینکے انہیں اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر گھر کو خیرباد کہنا پڑا، جس میں جانور بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

زیتا پوٹس کو گرو تھس وائل کے قریب رہنے کے لئے جگہ مل گئی۔ انہوں نے لکڑی کے تختوں سے ایک چھوٹا سا گھر تعمیر کیا اور اپنے گھر کے قریب ہی سویابین اور اناج کے بیجوں کی کاشت شروع کر دی لیکن خوشحالی کا خواب پھر بھی پورا نہ ہوا۔ بدنصیبی نے ایک بار پھر شبخون مارا۔ ایک رات کسی نے خاموشی سے اُن کے گھر کو آگ لگا دی۔ بیجوں کا ذخیرہ جل کر تباہ ہو گیا۔ اُن کی آنکھ اس وقت کھلی جب پُورے گھر میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اور لکڑی کے تختے دھائیں دھائیں جل رہے تھے۔ زیتا پوٹس نے جلدی جلدی اپنے شوہر کو جگایا اور اپنے تین بچوں کو لیتے ہوئے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی چنگاریاں چاروں طر

"کوکو ڈارلنگ! تم تو انسانوں سے کہیں زیادہ سمجھدار ہو"

اس بندر کا نام "کوکو" ہے؛ اس کے مالک
کا شمار نیویارک کے کروڑ پتیوں میں ہوتا
ہے۔ امریکہ میں جہاں بے شمار افراد نانِ
شبینہ کو ترستے ہیں اور انتہائی کسمپرسی کی
زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں
وہاں ایسے "متمول شرفا" کی بھی کمی نہیں جو محض
اپنے شوق پر ہر ماہ لاکھوں ڈالر خرچ کر
دیتے ہیں۔ کوکو ایک جانور ہے، اُسے
زندگی کی تمام سہولتیں اور آسائشیں میسر
ہیں جن سے لاکھوں انسان محروم ہیں۔
کوئی آسمانی معجزہ نہیں بلکہ دولت کا کرشمہ
ہے۔ کوکو کے کپڑے ایک خاص درزی
سلواتے جاتے ہیں۔ اُس کے گلے میں قیمتی
پڑے ہوتے ہیں جنھیں فروخت کر کے
فاقہ مست خاندانوں کو بے بسی کی موت
بچایا جا سکتا ہے۔ اُسے ہر دُوسرے رو
باربر شاپ بھیجا جاتا ہے۔ ایک باربر

...ے دی

...زنس کر رہی تھیں۔ وہ دونوں کچھ دور کھڑے ہوئے اپنے چھوٹے سے آشیانے کے جلنے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ زنیا کا کہنا ہے کہ "اس روز مجھے احساس ہوا کہ زندگی کے بعض واقعات انتہائی تلخ اور اندوہ ناک ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس گھر کے ساتھ میں بھی جل رہی ہوں"۔



...ے آرائش جمال کے لئے مخصوص ہے۔ ...جو اس کے بال کاٹتا ہے، شیو کرتا ہے اور ...پھر کوکو کے سامنے آئینہ رکھ کر اُس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک وہ اپنا سر ہلا کر 'اوکے' نہیں کہہ دیتا۔ کوکو کے لئے علیحدہ باورچی خانے کا انتظام ہے۔ ایک باورچی ہر روز اُس کی پسند کا کھانا پکاتا ہے۔ کوکو کو اگر کھانا پسند نہیں آتا تو وہ غصہ میں پلیٹ اٹھا کر باورچی کے منہ پر دے مارتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کوکو کا مالک خوب لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے پالتو جانور کے گلے میں باہیں ڈال کر زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے کہتا ہے "ڈارلنگ تم تو انسانوں سے کہیں زیادہ سمجھدار اور باوصف ہو"۔

عظیم امریکہ میں لاکھوں لوگ بھوکے سوتے ہیں

زنیا پوٹس کا شوہر ڈوک پوٹس زیادہ دیر ان حالات کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ دل کا مریض ہو گیا اور آخر ایک رات جب اُن کے گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا اور بچے آسمان سے خوان اُترنے کی دعائیں مانگ رہے تھے، پینتالیس سالہ ڈک اذیت کے ان لمحات کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کمزوری، نقاہت اور دل کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے غش کھا کر فرش پر گر پڑا۔ زنیا نے اپنے شوہر کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ بھوک سے بلکتے ہوئے بچے سہم کر خاموش ہو گئے۔ وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو سہمی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ اُن کا باپ اُنھیں تنہا چھوڑ کر جانے والا ہے۔ وہ تو یہ سمجھے کہ اُن کا باپ اُن کے چیخنے چلانے سے ناراض ہو گیا ہے۔ وہ چُپ ہو گئے تھے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی معصوم آنکھوں میں چھلکنے والے آنسوؤں کے قطرے خشک ہو گئے تھے اور اپنے باپ کو منانے کے لئے اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ڈک پوٹس نے یکبارگی اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنی بیوی کے ہاتھوں کو آخری بار گرمجوشی سے دبایا۔ اور ایک ہچکی لیکر خاموش ہو گیا۔

زنیا پوٹس اپنے شوہر کی موت کے بعد اپنے تین بچوں کے ساتھ اس "عظیم ملک" میں تنہا رہ گئی۔ جہاں کی سڑکوں پر رات کی تاریکی کبھی نہیں اُترتی۔ جہاں کے ہوٹلوں اور کلبوں کی ضیافتوں پر لاکھوں ڈالر پانی کی طرح بہائے جاتے ہیں۔ زنیا پوٹس نے امریکی معاشرے کے کھوکھلے پن اور سنگینیوں سے ہار نہ مانی۔ وہ تنہا کرد ھس 'والٹ' براؤن اور بارتھولومیو کی سڑکوں پر اپنے تینوں بچوں کے ساتھ مارچ کرتی رہی، اور زندہ رہنے کے لئے محنت، مشقت کا پہیہ پوری طاقت سے گھماتی رہی۔

وہ کہتی ہے "امریکہ میں مجھ سے زیادہ غریب اور بے کس افراد رہتے ہیں۔ وہ جہاں رہتے ہیں، وہ ہرگز اُن کے رہنے کی جگہ نہیں۔ اُن کے بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ اُن کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے

کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرا سکیں۔ وہ معاشرے کی سنگدلانہ غفلت اور بے حسی کا شکار ہو کر مجرم بن جاتے ہیں لیکن وہ مجرم نہیں ہیں بلکہ اصل مجرم ہمارا سماج ہے، جس کی بنیاد لُوٹ کھسوٹ اور ناانصافی پر رکھی گئی ہے"۔

زنیا پوٹس نے اپنی زندگی کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔

"اُن دنوں میں کاونٹی بارتھولومیو میں رہ رہی تھی۔ اُسی علاقہ میں ایک بڑے آدمی کے ہاں فرش کی صفائی کرتی تھی۔ ایک دن مجھے زور کا بخار چڑھ آیا۔ اور میں کام پر نہ جا سکی۔ گھر پر کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ بچے بھوکے تھے۔ مجھے مجبوراً شام کے وقت اُس بڑے آدمی کے گھر جانا پڑا۔ وہاں خوب ہلا گلا اور شور مچ رہا تھا۔ کسی شخص کی آمد پر ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دیکھ کر سخت سست کہا اور کام پر نہ آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے بتا دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ انھیں میری باتوں پر یقین نہ آیا۔ اور وہ بدستور مجھے بُرا بھلا کہتے رہے۔ جب میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو اُنھیں ذرا برابر رحم نہ آیا اور بڑی رکھائی سے کہا گیا "اس وقت تو کچھ نہیں ملے گا، البتہ ضیافت ختم ہو جائیگی تو پھر لے جانا۔"

زنیا پوٹس کا کہنا ہے کہ "بچوں کی بھوک کا خیال کر کے، میں رات کے تقریباً دو بجے تک دیوار کے سہارے کھڑی رہی، پھر کہیں جا کر کچھ ملا"۔

زنیا پوٹس کی عمر اس وقت ۴۴ سال کی ہے، اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں زندگی کے طویل تجربات کی تلخی نہیں بلکہ معصومیت اور افسردگی کی پرچھائیاں ہیں۔ وہ غربت کو بُرا نہیں سمجھتی۔ اُس نے ایک رپورٹر سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "غریب ہونا

واشنگٹن کو دیکھ کر اُس نے کہا:

'اِس ملک میں دَولت اور خوشحالی بھی ہے'



زیتا پوٹس کو انتہائی گندے علاقے میں رہنے پر مجبور کیا گیا

شرم کی بات نہیں۔ البتہ مفلسی اور تنگدستی سے خوف کھا کر حالات سے سمجھوتہ کر لینا بڑی شرم کی بات ہے"۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی حالات سے سمجھوتہ نہ کیا اور ہمیشہ اپنے بچوں کی خوشحال زندگی کے تصور میں تلخ ترین ایام ہنس ہنس کر گذار دیئے۔ وہ اس بات پر پکّا یقین رکھتی ہے کہ امریکہ کے غریب عوام اتحاد اور یگانگت کے جذبے سے اپنے بیشتر مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اور ایسے افراد سے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتے ہیں جو قدم قدم پر ان کی لگاتار ذہنی اور جسمانی محنت سے اپنے لئے عیش اور آرام کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

زیتا پوٹس نے اپنی جیسی محروم عورتوں کے ساتھ مل کر کولمبس کے قریب اروِن یونین فاؤنڈیشن قائم کی۔ اس فاؤنڈیشن کی ایک خاص بات ہے کہ اس میں کسی بڑے سرمایہ دار کی مالی امداد شامل نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد اس علاقے کی غریب خواتین کے چندے سے رکھی گیا ہے۔ اس دفتر میں متوسط طبقے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتیں اپنے گھریلو مسائل کے سلسلے میں مشورہ لینے آتی ہیں۔ زیتا چند گھنٹے اس دفتر میں گزارتی ہے۔ اور اپنے تجربات کی روشنی میں بلا معاوضہ غریب افراد کو مشورے اور ہدایات دیتی ہے۔

وہ جہاں رہتی ہے وہاں کے بیشتر افراد اس کی بڑی عزت کرتے ہیں، اپنی الجھنوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اُس کے پاس آتے ہیں۔ وہ بڑے خلوص سے انھیں راستہ دکھاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے "کہ اگر ہار مان گئے تو زندگی زیادہ تلخ ہو جائے گی۔ حالات سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک زمین پر پیر جمانے کی جگہ نہیں مل جاتی۔ اگر ایسا معجزہ ظہور میں آجائے تو پھر اپنے جیسے لوگوں کے حقوق کے لئے لڑنا شروع کر دو۔ اور اُس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک معاشرے کے فرسودہ اور گھٹیا رسم و رواج بدل نہیں جاتے"

زیتا پوٹس امریکہ کی موجودہ پالیسی کے سخت خلاف ہے۔ ایک دن وہ اپنے چھوٹے سے گھر کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہی تھی کہ اُسے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔ ٹیلیگرام واشنگٹن کے شہریوں کی جانب سے بھیجا گیا تھا جس میں ویت نام کی جنگ کے خلاف شہریوں کے احتجاجی جلوس میں اُسے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "اچھا تو میرے حالات کی خبر اس شہر میں بھی پہنچ گئی جہاں امریکہ کا مالک و مختار قصرِ سفید میں آرام سے رہتا ہے"۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ایک دیو پیکر جہاز میں سوار ہو کر واشنگٹن پہنچی۔ اس نے اس شہر کے قصے سُن رکھے تھے، آج اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ فلک بوس عمارتوں کی طویل قطاریں، لمبی کشادہ سڑکیں، اُن پر پھیلی ہوئی سینکڑوں، ہزاروں چمکیلی کاریں۔ ریستوران، ہوٹل، وہسکی، رقص گاہیں، اور نائٹ کلب، ایک عجیب دُنیا اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلی تھی۔ جو اُس کی دُنیا سے یقیناً مختلف تھی، خوشحال تھی، صاف و شفاف تھی، ہنستی اور مسکراتی ہوئی دُنیا تھی۔ اُس نے اپنے استقبال کرنے والوں سے کہا "امریکہ میں غربت کے علاوہ دولت اور خوشحالی بھی ہے"۔

وہ احتجاجی جلوس میں سب سے آگے تھی۔ اس کے چاروں طرف انسانوں کا لہراتا ہوا سمندر تھا۔ اُس نے پہلی بار سوچا: امریکہ میں اُس جیسے لاکھوں انسان ہیں، وہ تنہا نہیں ہے۔ اگر وہ سب آپس میں مل جائیں تو دُکھ کے دن جلدی کٹ جائیں گے، اور اُس کا برسوں پرانا خواب حقیقت بن جائے گا۔ اس نے امریکی صدر کے سیکرٹری کو مراسلہ دیتے ہوئے کہا "صدر سے کہیے گا امریکہ کے غریب عوام ویت نام کی جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ جو مال و زر غیر ضروری جنگوں پر صرف کیا جا رہا ہے، اس سے ایک نیا امریکہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ ایک خوشحال اور مطمئن امریکہ"



کریم بخش قلعی گر

۹ سال سے خسارے کا

بجٹ پیش کر رہا ہے

نمائندہ الفتح

۵۴ سالہ کریم بخش ایک قلعی گر ہے۔

بکرا پیڑی کی ایک جھگی میں رہتا ہے۔ نرسری سوسائٹی میں ایک دو منزلہ مکان کے نیچے اُس کی ایک چھوٹی سی دکان ہے، جس میں وہ بیٹھ کر دن بھر پیتل اور تانبے کے برتنوں پر قلعی کرتا ہے۔ اس کا کام پرانے اور زنگ آلود برتنوں کو آگ اور مسالحہ میں رگڑ رگڑ کر چمکانا ہے۔ صاف شفاف چمکتے ہوتے برتنوں کو دیکھ کر اُس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ کھِل اُٹھتی ہے مگر برتنوں کی چمکتی سطح میں اپنے آپ کو دیکھ کر وہ مایوس اور پژمردہ ہو جاتا ہے۔ وہ سالہا سال سے یہ کام کر رہا ہے۔ اس نے لاکھوں برتنوں کو چمکایا ہوگا مگر وہ اپنے آپ کو نئی زندگی کی چمک نہ دے سکا۔ اُس کی جواں سال زندگی مفلسی، محرومی اور مشقت کے گرد و غبار میں اس قدر دھندلا گئی ہے کہ وہ اپنی دکان پر پڑے ہوتے پرانے — برتنوں کی طرح سال خوردہ اور زنگ آلود برتن نظر آتا ہے۔

رحیم بخش روزانہ اپنی پرانی سائیکل پر بکرا پیڑی سے نرسری آتا ہے۔ صبح آٹھ بجے دکان لگاتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی کو دکان پر بٹھا کر سوسائٹی کے گھروں سے پرانے برتن جمع کرنے کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ گیارہ بارہ بجے کے بعد وہ دکان کے باہر چھوٹی سی بھٹی سلگاتا ہے اور پھر برتنوں پر قلعی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کے جسم پر ایک میلی قمیص تھی، جس پر جگہ جگہ پیوند لگے تھے، گرد، میل اور پسینے سے اُس کی پتلون کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔

جب میں نے اُس سے اُس کی آمدنی اور اخراجات کے بارے میں سوال کیا تو اُس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بابو جی ہماری کیا آمدنی اور کیا اخراجات۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دس بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد جو کچھ ملتا ہے اس سے دو وقت کی روٹی چل جاتی ہے۔ اس کے آگے بس اللہ کا نام ہے۔"

رحیم بخش نے بتایا کہ اُس کی روزانہ آمدنی زیادہ سے زیادہ ۵ روپے ہے۔ مہینے میں چند دن بیکاری میں گزرتے ہیں۔ کیونکہ اُس کے پاس قلعی کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح ہر ماہ اُس کی زیادہ سے زیادہ آمدنی ۱۳۵ روپے بنتی ہے اُسے بڑی مشکلوں سے اس محدود آمدنی میں گزر بسر کرنا پڑتی ہے اگر مسلسل دو تین روز کام نہیں ملتا تو پھر اُس کے گھر میں فاقہ کی نوبت بھی پہنچ جاتی ہے اور ایسا تو اکثر ہوا کہ جب وہ تھکا ہارا اپنے گھر پہنچا تو چولھا ٹھنڈا ملا۔

وہ اپنی روزانہ کی آمدنی کے حساب سے اخراجات میں کمی بیشی کرتا ہے۔ ہر دوسرے دن ساڑھے نو آنے کے حساب سے ۲ سیر آٹا خریدتا ہے۔ اس طرح ہر ماہ آٹے کی خریداری پر اُسے ۳۰ روپے تک خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ سالن میں وہ عام طور پر سبزی استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی آمدنی کے مطابق روزانہ آٹھ آنے کی سبزی خریدتا ہے اس مد میں ۱۵ سے ۲۰ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایندھن کے لئے وہ روزانہ لکڑی اور مٹی کا تیل خریدتا ہے جو کہ بندھی آمدنی میں ہر ماہ بیس روپے تک بیٹھتے ہیں۔ پانی بھرنے کا اُسے موقع نہیں ملتا چنانچہ وہ ماشکی سے روزانہ دو آنے میں ایک مشک پانی خریدتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچّہ مستقل کسی نہ کسی بیماری میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کے تین افراد کے علاج معالجے پر ہر ماہ ۱۵ روپیہ تک اُٹھ جاتے ہیں۔ اُسے ہر روز اپنے بچے کے لئے آدھ سیر دودھ خریدنا پڑتا ہے اس کے عوض اُسے ہر ماہ ۱۵ روپے سے لے کر ۲۰ روپے تک ادا کرنے پڑتے ہیں۔ نمک مرچ اور مصالحہ وغیرہ پر روزانہ تین آنے خرچ آتے ہیں۔ مہینے میں ایک بار وہ ۲ روپے کا گوشت خریدتا ہے اور روزانہ سائیکل کی مرمت بھی کرانی پڑتی ہے۔ ہر روز تین چار آنے کا بناسپتی گھی خریدتا ہے لیکن گھی کا خرچ ضروری اخراجات

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

تعارف بیگمات کا

کاک ٹیل پارٹیاں اور اُن کا حسنِ انتظام .....

' ابھی تو میں جوان ہُوں '

لاہور، کراچی اور راولپنڈی کی اُن نادر ہستیوں سے بغیر معذرت کے جنھیں اس خاکے میں اپنی جھلک نظر آسکتی ہے اگر بیگمات میں سے کوئی ایک اسے پڑھ کر آئینہ دیکھنے پر مجبور ہو جائیں تو ہم سمجھیں گے کہ محنت بر آئی۔

نقش فریادی ہے ان کی شوخیٔ تحریر کا۔

آپ ایک معروف سماجی سیاسی کارکن خاتون ہیں اپنی سماجی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں، عرصہ دراز سے ایک عدد ادبی رسالے کی مدیرہ اعلیٰ بھی ہیں ثبوت کے لئے رسالے کی پیشانی پہ ہر ماہ دفتر کے ساتھ ساتھ رہائش گاہ کا پتہ بھی لکھتی ہیں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت ..... رہائش گاہ کا ٹیلی فون نمبر بھی درج ہوتا ہے، مزید ضرورت کے لئے۔

رہائش گاہ کے ضمن میں انھیں بڑے شہروں میں اپنی بڑی کوٹھیاں بنانے (ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں نہیں) کا از حد شوق ہے۔ صاحبِ ذوق ان کوٹھیوں کو تجارتی نقطہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں، جہاں انٹر کانٹی نینٹل ہے، وہاں اُن کی کوٹھی ہے۔ احتیاطاً ایک بنگلہ انٹر کان والے شہر سے دور گاؤں میں بھی تعمیر کروا لیا ہے، دیکھو تو جنگل میں منگل والا محاورہ سمجھ میں آتا ہے۔ ویسے یہاں اُن سے ملاقات کا روز اتوار ہے، ہر روز اتوار نیست کہ ....

شعر و ادب سے بھی دلچسپی ہے اکثر مشاعروں کے منتظمین نے صدرِ مشاعرہ کے روٹھ کر چل دینے، یا مشاعرہ ہوٹ ہونے پر اُنھیں کرسیٔ صدارت بخشی اور انھوں نے اپنی زیرِ صدارت نہ صرف دو غزلے سہ غزلے ارشاد فرمائے بلکہ طالب علموں کی آٹو گراف بکیں سامنے رکھ کر عمرِ رفتہ کو چیخ چیخ کر آوازیں بھی دے ڈالیں۔ اور مسندِ صدارت سے اُس وقت الگ ہوئیں جب اُن کے دو ایک ہم رتبوں نے انہیں ان کی بزرگی کا واسطہ دیا۔

اب اپنے قلم سے ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے، جو بقول اُن کے اُنہیں کی آپ بیتی ہے۔ سو ہیروئن کے حسن کی تعریف میں جابجا رتن ناتھ سرشار کی فسانۂ آزاد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ خالی جگہ غالب کی غزلوں سے پُر کی گئی ہے۔ اور بطور ہیرو شوہرِ نامدار (اپنے) کو پیش کیا ہے۔ ان کے حُسن، مردانہ وجاہت، موہنی شخصیت، جادو بیانی اور دیگر خصوصیات کے اظہار کے لئے کتاب کے کئی سو صفحات صرف کئے گئے ہیں مگر کتاب پڑھنے والے شوہر (ان کے) کو دیکھتے ہی قسمیں کھاتے ہیں کہ بخدا یہ تو وہ نہیں اور شوہر کو دیکھنے والے کتاب پڑھ کر کہتے ہیں کہ نہیں، ایسا تو نہیں ۔۔۔ نہ ہی یہ شوہر وہ ہیرو اور وہ ہیرو یہ شوہر نہ سہی۔ بات کتاب کی ہے اور مصنفہ کے مروت کی صداقت سے ہمیں انکار نہیں ۔

آپ کو گھر پر دعوتیں دینے، فوٹو کھینچوانے (پریس فوٹو گرافروں کو ترجیح دی جاتی ہے) تقریریں چھپوانے، اخباری نمائندوں کو گھر بلانے، مختلف انجمنوں، سوسائیٹیوں کلبوں اور ثقافتی اداروں کی تقریبات کا اہتمام کر کے صدارت فرمانے اور اسی قسم کی دُوسری بھاگ دوڑ کرنے کا جنون ہے۔ کھڑی (صرف الیکشن کے لئے ہوتی ہیں، پھر بیٹھ بھی جاتی ہیں الیکشن کے بعد) تصاویر کا شوق اپنے رسالے کے ٹائیٹل پہ اپنی تصویر مع فیملی کے چھاپ کر پورا کرتی رہتی ہیں۔

پاکستان کی ساری بیگمات سے یہ خفا ہیں اور سب کو اپنا کمپیٹیٹر سمجھتی ہیں، کہتی ہیں اگر اب کبھی الیکشن ہُوئے اور اسمبلی کی ایک آدھ سیٹ میرے ہاتھ لگ گئی تو ان سب کو ٹکرے لگا دوں گی۔ عام خواتین سے بھی اُنھیں شکایت ہے کہ اپنی محبوب امیدوار کو ووٹ نہ دیکر انہوں نے خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی (یا کلہاڑا) مار لی ہے۔ اب کون اُن کے حقوق کے لئے لڑے گا۔ کون اُنہیں معاشرے میں جائز مقام دلانے کی سعی کریگا۔ کون ان سے کی جانے والی ناانصافیوں کا بدلہ لے گا۔ اور کون ظالم سماج سے اُن کی برابر کی حیثیت منوائیگا۔ اسمبلی کی سیٹ ملتی تو وہ یہ سب کچھ کرتیں۔ مگر افسوس ہماری قوم کی خواتین کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ اپنی بھلائی نہیں سوچتی اور نہیں جانتی کہ کوئی، ثقافتی، سماجی تہذیبی، اخلاقی، سیاسی، ادبی کام اسمبلی کی سیٹ سے دور رہ کر نہیں ہو سکتا۔ اسمبلی کے باہر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

آپ ہر وقت متفکر رہتی ہیں کہ قوم نے اُن کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حالانکہ ہزاروں کنواروں کی شادیاں اپنے ہاتھ سے کروا چکی ہیں۔ اپنے گھر پر "سوشل کاز" کے بہانے باقی ہزاروں کو ملاقاتوں کے مواقع فراہم کروائے ہیں۔ زیادہ کام بھی نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہی کیا ہے مگر نوجوان ہیں کہ گھر لیجا کر اُنھیں پوچھنے بھی نہیں آتے۔ نیرنگیٔ سیاستِ دوراں ہی تو ہے کہ سیاست کی چوکھٹ سے سر ٹکرا کر شہر کا ایک مخصوص علاقہ اپنے لئے ممنوع کروا لیا ہے۔

کاک ٹیل پارٹیوں میں اُن کے حسنِ انتظام اور سلیقے کی شہرت عالمگیر تھی (اب بھی ہے) سوچتی ہیں، مر گئی تو' نہیں نہیں، مرنے کا ذکر ابھی نہیں "ابھی تو میں جوان ہوں" ان کا خیال ہے۔

ان کا خیال یہ بھی ہے کہ صدارتی تقاریب اور تقاریر سے فرصت ملی تو ایک اور کتاب تصنیف فرمائیں اور اس کا عنوان بھی غالب کی غزل سے لیں اور اپنی تمام حریف بیگمات کے شوہروں کو بشکلِ ہیرو پیش کریں۔ ہیروئن کا انتخاب زیرِ غور ہے۔ ویسے اُن کی حریف دل جلی بیگمات کا کہنا ہے کہ اپنی ہر تحریر کا مرکزی کردار یہ خود ہی ہوتی ہیں۔ نئی کتاب میں بھی اس دھونس سے باز تھوڑی آئیں گی۔

ڈیرہ غازی خان کی ڈسپنسریوں میں

مکسچر تو کیا میٹھا سوڈا بھی دستیاب نہیں

میں ہسپتال کے باہر آخر کب تک بیٹھا رہوں گا،
کیا مجھے داخلہ نہیں ملے گا ——— ؟

جب کسی دہقان کا بیل ایک مدّت تک محنت اور مشقت کرنے کے بعد بوڑھا اور لاغر ہو جاتا ہے تو اُسے قصاب کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ تو ایک حیوان کا حال ہے۔ ہمارے ملک کا وہ انسان جو سماج کے لئے اناج پیدا کرتا ہے۔ سخت سردی اور سخت گرمی میں دن رات کی محنت سے اچانک کسی مہلک بیماری کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ بھی ایک بیل کی طرح بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بیمار بیل کو فوراً کسی قصاب کے حوالے کر دیا جاتا ہے لیکن بیمار کسان کو تڑپ تڑپ کر مرنے کی مہلت دے دی جاتی ہے۔

کسانوں میں ملیریا کی بیماری عام ہوتی ہے۔ ملیریا کے بگڑ جانے سے مختلف قسم کی خطرناک بیماریاں پروان چڑھتی ہیں۔ اور اکثر کسان ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ کسانوں کو دیہات اور قصبات میں ابتدائی ادویات بھی میسر نہیں ہوتیں۔ گھر کا رہا سہا اثاثہ بیچنے کے بعد دیہاتی شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔ کچھ کو ہسپتال میں داخلہ مل جاتا ہے اور بیشتر کو اس سہولت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ہسپتال میں داخلہ ملے یا نہ ملے، لیکن ہسپتال سے اُنھیں دوائی نہیں ملتی۔ دیہات کی ڈسپنسریوں سے بدتر انتظام شہروں کے ہسپتالوں کا ہوتا ہے۔ ان ہسپتالوں میں ہر مرض کی ایک ہی دوا لال، گلابی مکسچر کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہسپتالوں کی دوائی بازار میں فروخت ہونے والی دوائی کے مقابلے میں نہایت ہی گھٹیا ہوتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر حضرات مریضوں کو ادویات کی بجائے پرچیاں لکھ دیتے ہیں تاکہ ادویات بازار سے خریدی جا سکیں۔ بازاری دواؤں کی قیمتیں اتنی گراں ہوتی ہیں کہ مریض کی قوتِ خرید جواب دے جاتی ہے۔ جب غریبوں کی رہی سہی پونجی ختم ہو جاتی ہے تو پھر اُن مریضوں کی آنکھیں اندر کو دھنس جاتی ہیں۔ اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔

یوں تو ضلع ڈیرہ غازیخاں کے دیہات و قصبات میں بہت سی ڈسپنسریاں قائم ہیں۔ لیکن اُن کی یہ حالت ہے کہ کسی ڈسپنسری کی دیوار ناکارہ ہے، کسی میں مریضوں کے لئے چارپائیاں نہیں ہیں۔ اور بعض ڈسپنسریوں میں تو پینے کا پانی بھی موجود نہیں ہوتا۔ جہاں تک ادویات کا تعلق ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی ڈسپنسریوں میں مکسچر تو کیا میٹھا سوڈا بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ ضلع بھر میں ایم ایس ہیلتھ سروسز اور ڈسٹرکٹ کونسل کے زیرِ انتظام ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۳۵ ہے، جنھیں چلانے کے لئے تینوں محکموں کو گورنمنٹ کی طرف سے علیحدہ علیحدہ گرانٹ ملتی ہے، ادویات کی خریداری کے لئے شاید بجٹ بہت کم ہوتا ہے۔ عام لوگوں کو شکایت ہے کہ ہسپتال کی ادویات فروخت کر دی جاتی ہیں۔ جب کہ اِن ادویات پر ناقابلِ

نرسری مرچنٹ ویلفیئر
سوسائٹی کے انتخابات ہو گئے

گذشتہ ہفتے، نرسری مرچنٹ ویلفیئر سوسائٹی کے انتخابات ہوئے۔ بڑے انتخابات سے گذرنے والوں نے نرسری کے دکانداروں کے حلقے میں محدود چھوٹے انتخابات میں بھی دلچسپی اور سرگرمی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ انتخابات قومی بنیاد پر ہوں یا کمیونٹی کی سطح پر، ان کا مقصد اصلاحِ احوال ہے اور چھوٹے چھوٹے مسائل اور الجھنوں سے اجتماعی طور پر نمٹنے کا ایک مؤثر ذریعہ۔ نرسری مرچنٹ ویلفیئر سوسائٹی کے انتخابات میں کاروباری حلقے کی دلچسپی سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ اس مقصد سے بخوبی آگاہ ہیں۔

انتخابات میں جناب ریاض احمد صدر۔ جناب محمد خلیل احمد نائب صدر، جناب اقبال احمد خان نائب صدر۔ جناب افضل فاروقی جنرل سیکرٹری۔ جناب سلیم عادل جوائنٹ سیکرٹری۔ جناب عبدالواحد پروپیگنڈہ سیکرٹری۔ اور جناب احمد عبدالغنی خازن منتخب کئے گئے۔

نرسری کے کاروباری حلقوں کا خیال ہے کہ منتخب عہدیدار دکانداروں کے مسائل حل کرانے کے فرائض سے پوری طرح عہدہ برآ ہوں گے۔



نرسری مرچنٹ ویلفیئر سوسائٹی کے عہدیداروں کا گروپ فوٹو۔ درمیان میں سوسائٹی کے صدر جناب ریاض احمد کھڑے ہیں۔

اکثر کسان ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں

فروخت کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔ بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں ادویات کی قلت کا مسئلہ قابلِ غور اور حل طلب ہے۔ ورنہ ادویات کے بغیر ہسپتال اور ڈسپنسریاں بیکار اور بے مقصد ہیں۔ اور عملہ کی تنخواہیں مفت تقسیم کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ڈسپنسریوں کے لئے ادویات کی فراہمی جلد سے جلد نہیں ہو سکتی تو اس سے کہیں بہتر ہے ان کو کمپاؤنڈروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اور ایک خود مختار ادارے کی حیثیت دے دی جائے تاکہ کمپاؤنڈر حضرات تجارتی بنیادوں پر غریب عوام کے علاج کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہوگا کہ غریب دیہاتی شہر میں در بدر ہونے سے بچ جائیں گے۔ ویسے بھی مریضوں کو ہسپتال کی بجائے بازار سے ادویات خریدنا پڑتی ہیں۔ مجوزہ صورت میں ڈسپنسری سے ہی ادویات خرید لیا کریں گے۔ دیہات تو دیہات شہر میں بھی علاج معالجے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ پورے ضلع میں تقریباً آٹھ لاکھ کی آبادی کیلئے صرف ایک سرکاری ٹی بی کلینک ہے جس میں کل چھ عورتوں اور چھ مردوں کے لئے ایک درجن بستروں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسی طرح شہر میں ایک سول ہسپتال ہے جس میں تقریباً ۱۲۵ چارپائیوں کا انتظام ہے۔ چار ڈاکٹر دو لیڈی ڈاکٹر اور دو نرسیں کام کرتی ہیں۔ جو اتنے بڑے ہسپتال کے لئے بہت کم ہیں۔ خواتین کو میٹرنٹی ہوم کی سہولتیں بھی بہت کم میسر ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے جو عام آدمی کے لئے بہت زیادہ تصور کی جاتی ہے۔ ہسپتال کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ اس کے اطراف میں پیپ اور خون سے لت پت روئی اور چیتھڑے بکھرے رہتے ہیں۔ سول ہسپتال میں بھی ادویات کا نہ ہونا اچنبھے کی بات نہیں تو پریشان کن ضرور ہے۔ اگر ادویات کے لئے بجٹ کم ہے تو اس میں اضافے کی شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ اس مہنگائی کے دور میں پرائیویٹ علاج بھی روز بروز مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر عوام کو صحیح معنوں میں طبی سہولتیں حاصل ہو گئیں تو ممکن ہے غریب لوگ علاج کے بغیر وقت سے پہلے موت کا لقمہ بننے سے بچ جائیں۔

ساقی جاوید

مُجرم

وہ کہ ایک مُجرم ہے۔ وہ کہ ایک قاتل ہے
نفرتوں کے قابل ہے
اُس پہ رحم کیا معنی!
اُس نے میر جعفر کے عہد کی علامت کو
اُس نے مکر و سازش کی بدنما روایت کو
بُت بنا کے پُوجا ہے
اُس نے اپنے پاؤں سے
اِس وطن کی ماؤں کی، مامتا کے پھولوں کو
بے دریغ کُچلا ہے
اُس نے اپنی دوشیزہ چاند چہرہ بہنوں کی عصمتوں کو لُوٹا ہے
اُس نے اپنے بچّوں کے نُور نُور جسموں کو
برچھیوں سے گودا ہے
گولیوں سے داغا ہے
اُس پہ رحم کیا معنی!
اُس نے اپنے سینے کی زہر زہر ظلمت کو
شہر شہر پھیلایا
اُس نے اپنے ہونٹوں کی جنبشوں سے، نفرت کی دوزخوں کو دہکایا
وہ امینِ راوی تھا، وہ حلیفِ پدما تھا
اُس کو اپنی مٹّی کا ہم نے نُور سونپا تھا
اُس نے اپنی دھرتی کی لازوال عظمت کو
اِک کرِیہہ جذبے کی تیرگی میں کفنا کر
اِک ذلیل دشمن کے نامراد قدموں پر ڈالنے کی کوشش کی
اُس نے اپنے پرچم کے چاند اور ستارے کو
چاک چاک کر ڈالا
اُس نے اپنی حرمت کو
اپنے تیز خنجر سے خود ہلاک کر ڈالا

برطانیہ میں ہونے والے پہلے ٹسٹ میچ پر تبصرہ

پاکستانی کھلاڑی مچھلی اور چپس پر گزارا کر رہے تھے


ظہیر عباس


مشتاق محمد


آصف مسعود

بارش نے

برطانیہ کو ایک عبرتناک شکست سے بچالیا

سعید اور سرفراز کو قومی ٹیم میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟

لطافت علی صدیقی

اگلے دو ٹسٹ میچوں میں پاکستان کی کامیابی سے قطع نظر برطانیہ کی روانگی سے قبل انتخاب علم نے اپنی قوم سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے برمنگھم کے پہلے تاریخی ٹیسٹ میچ میں پورا کر دکھایا۔ پاکستانی کھلاڑیوں نے اعلیٰ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ پاکستانی بیٹسمینوں نے برطانوی بالروں کے چھکے چھڑا دیے۔ کرکٹ کی تاریخ میں پاکستانی کھلاڑیوں کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔

برطانیہ کو بارشوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے جس نے اُسے یقینی اور عبرتناک شکست سے بچالیا۔ پہلے ٹیسٹ میچ کا آخری دن بارشوں کی نذر ہو گیا۔ پاکستانی بالر برطانوی بیٹسمینوں کو غارت کرنے کی بجائے پویلین میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ اگر برطانیہ کو شکست سے بچانے کے لئے بارش امداد کو نہ آتی تو پاکستان کے حصے میں ایک عظیم کامیابی یقینی تھی۔

پھر بھی عظیم اور قدآور برطانیہ کے مقابلے میں پاکستان کو اخلاقی فتح حاصل ہو چکی ہے۔ غیر متوقع بارش فتح کے راستے میں حائل ہو گئی۔ ورنہ پاکستانی کھلاڑیوں نے اپنے بہترین کھیل سے ۱۹۵۴ء کے اوول ٹیسٹ کی یاد تازہ کر دی، جب پاکستان کو پہلی بار برطانیہ پر برتری حاصل ہوئی تھی۔

برمنگھم کے پہلے سرکاری میچ میں پاکستانی کھلاڑیوں نے جس شاندار اور غیر متوقع کھیل کا نمونہ پیش کیا اس پر وہ بجا طور پہ تعریف و تحسین کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ خصوصاً ظہیر عباس، مشتاق محمد، آصف اقبال، قدآور بالر آصف مسعود نے ایک طویل مردنی اور خلاء کے بعد پاکستانی کرکٹ کی زندگی میں دوبارہ نئی روح پھونک دی ہے۔

۲۳ سالہ ظہیر عباس گذشتہ تین سالوں سے انتہائی فارم میں تھے۔ اور مسلسل سینچریاں بنا رہے تھے لیکن انہیں ٹسٹ اور بین الاقوامی کرکٹ میں مناسب موقع نہیں دیا گیا۔ مجھے دو سال قبل کا واقعہ یاد ہے جب وہ سلیکٹرز اور اخباری نمائندوں سے اپنے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے خلاف وکالت کرتے تھے۔

ہمارے کھیلوں کی تاریخ میں ایسا اکثر ہوا کہ اچھے اچھے اور عمدہ کھلاڑیوں کو نظر انداز کیا گیا یہ رویہ خاصہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ اچھے کھلاڑی عدم توجہی اور سردمہری کا شکار ہو کر حوصلہ ہار گئے اور انہوں نے دل شکستہ ہو کر کھیل کا میدان چھوڑ دیا لیکن ظہیر عباس ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمت ہار کر گمنامی کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے قطعی مختلف نکلا۔ اُسے جتنا دبایا گیا اس نے اتنا ہی اُبھرنے کی کوشش کی اس کے ساتھ جتنی ناانصافی کی گئی، اس نے اپنے کھیل کی تیکنیک میں نیا پن پیدا کر کے اپنے ساتھ ہونے والی سنگین ناانصافیوں کا بھرپور جواب دیا۔ اس نے اس سال قائد اعظم اور بی بی سی ٹرافی میں اعلیٰ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اور بالآخر برطانیہ میں اپنی ٹیم کی سرخروئی کا باعث بن گیا۔

ظہیر عباس نے برطانیہ کے دورے میں ورسسٹر شائر کے خلاف سینچری بنائی۔ اس کے بعد غیر سرکاری ٹیسٹ میچوں میں ایک اور سینچری کے علاوہ کئی نمایاں کامیابی حاصل کر کے ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ اور آخرکار وہ عظیم دن بھی آگیا جب اُس نے اپنے آپ کو رن بنانے کی مشین بنا دیا۔ وہ پہلا پاکستانی کھلاڑی ہے جس نے انگلینڈ کے خلاف طویل اننگ کھیلتے ہوئے ایک تاریخ رقم کی۔ ۱۹۶۷ء میں حنیف محمد نے لارڈز میں ۱۸۷ کا اسکور کیا، اور برطانوی بالروں کی زبردست جدوجہد کے باوجود آؤٹ نہیں ہوا۔ تاہم ۱۹۵۲ء میں حنیف محمد نے ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلتے ہوئے ۹ گھنٹے اور ۳۹ منٹ میں ۳۳۷ رنز بنائے تھے گریسوبر نے ۱۹۵۹ میں پاکستان کے خلاف کھیلتے ہوئے ۳۶۵ رنز بنا کر عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔

ظہیر عباس اس سیزن میں ایک ہزار رنز مکمل کرنے والا پہلا کرکیٹیر ہے۔ اس کے اسکور کی وجہ سے پاکستان کا اسکور سات وکٹوں پر ۶۰۲ رن سے زیادہ ہو گیا جو موجودہ ٹیسٹ سیریز میں سب سے زیادہ اننگ کا ایک ریکارڈ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں ناٹنگھم میں ۶ وکٹوں پر ۵۵۸ کا اسکور تھا۔

اس کے بعد ظہیر عباس اور مشتاق نے سیکنڈ وکیٹ پارٹنرشپ میں کرکٹ کی تاریخ میں ایک نیا باب لکھا جبکہ ۱۹۶۲ء کے اوول میں ٹڈ ڈکسٹر اور کولنگر کا ڈرے کے اشتراک سے ۲۴۸ رنز کا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ پاکستان کی اس عظیم الشان کامیابی میں مشتاق کے گرانقدر تعاون کا زبردست ہاتھ ہے۔ اس کے بغیر ظہیر عباس سے شائد اس معیار کے کھیل کا مظاہرہ ممکن نہ ہوتا۔ اس کے بعد شیر دل بیٹسمین آصف اقبال نے برطانوی بالروں کے مسلسل حملوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے سو کا معروف ہندسہ مکمل کر لیا۔

آصف مسعود نے بالنگ شروع کی اور اپنی لاجواب بالنگ سے برطانوی بیٹسمینوں کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ اس نے پہلی اننگ میں ۱۱۱ رنز پر ۵ وکیٹ لئے

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

قارئین کہتے ہیں



فلمسٹار شبنم اچانک ڈھاکہ کیوں چلی گئی تھیں؟

فلم اسٹار شبنم کا شمار چوٹی کی اداکاراؤں میں ہوتا ہے۔ فلم ساز و ہدایت کار احتشام نے انہیں چندا میں متعارف کرایا، وہاں چند ایک اردو فلموں میں کام کرنے کے بعد مغربی پاکستان چلی آئیں۔ یہاں کی فلمی صنعت نے اُنھیں گلے لگایا۔ بے شمار فلموں پر معاہدے ہُوئے اور عزت، شہرت اور دولت اُن کے قدموں پر نچھاور ہو گئی۔ بلاشبہ فلم اسٹار شبنم ایک اچھی اداکارہ ہیں۔ کیمرہ کے علاوہ اپنی زندگی میں بھی اداکاری کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آزمائش کی گھڑی میں دوستوں اور دُشمنوں کی پہچان ہوتی ہے، سو اداکارہ شبنم نے آزمائش کے لمحات میں اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے حالیہ بحران سے قبل بے شمار فلمی معاہدوں کو نظرانداز کر کے وہ اچانک ڈھاکہ چلی گئیں۔ ان کے اس طرح چلے جانے سے فلمسازوں کو لاکھوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اُن کے ڈھاکہ جانے میں سیاسی مصلحت تھی۔ کیوں کہ وہ اور دُوسرے بے شمار لوگوں کی طرح سمجھ رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا۔ وہاں پہنچ کر وہ عوامی لیگی سیاست میں گلے گلے دھنس گئیں۔ ان دنوں ان کا گھر انتہاپسند سیاسی لوگوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہاں بڑے بڑے منصوبے بنتے تھے۔ جب عوامی لیگی سیاست اور مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کی سازش ناکام ہو گئی تو شبنم نے بھی اپنی اداکاری کا موڈ فوراً تبدیل کر لیا اور بھاگ کر مغربی پاکستان چلی آئیں۔ یہاں آ کر اُن کے خاوند نے بیان دیا کہ عوامی لیگ کے رضاکار انھیں پریشان کرتے رہے اور اُن سے جبراً چندہ وصول کرتے رہے۔ سینہ زوری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ کالعدم عوامی لیگ کے سلسلے میں اُن کی جو سرگرمیاں تھیں اُس کی تصدیق اُن کے فیملی ڈاکٹر سے ہو سکتی ہے، جو ڈھاکہ میں رہتے ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ شبنم نے اُن فلمسازوں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا ہے جن کے لاکھوں روپے اُن کی سیاسی اداکاری کی نذر ہو گئے تھے۔ اور اب دوبارہ اپنا دامن جھاڑ کر فلموں کی شوٹنگ میں حصّہ لینا شروع کر دیا ہے۔

انور زاہد - لاہور

۸۰ فیصد کاروباری لوگوں نے جعلی ناموں سے نوٹ جمع کرائے

۱۰۰ اور ۵۰۰ کے کرنسی نوٹوں کی منسوخی کے بعد یہ بات ہمارے علم میں آئی ہے کہ کاروباری طبقے سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۸۰ فیصد افراد نے ہزاروں روپے کے نوٹ غلط ناموں اور جعلی دستخطوں سے جمع کرائے ہیں۔ ایسے ملک دُشمن عناصر کو عوامی سطح پر بے نقاب کرنے کے لئے "پاکستان یوتھ لیگ" ایک مہم شروع کرنے والی ہے

(ا) - اُس شخص کو نقد انعام دیا جائے گا جو جعلی رقم کی تفصیلات دے گا۔

(ب) تفصیلات ہر طرح سے مکمل ہونی چاہئیں یعنی اُن میں نام پتے اور پیشے کی تفصیلات

(ج) اگر حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے نزدیک تفصیلات غلط قرار پائیں تو اطلاع دینے والے کو انعام نہیں دیا جائے گا۔

(د) حاصل شدہ اطلاعات، ایک رپورٹ کی شکل میں تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کی جائے۔

(ر) تفصیلات مکمل صیغۂ راز میں رکھی جائیں گی۔ پاکستان یوتھ لیگ کی جانب سے مسٹر محبوب حسن کو بحیثیت کنوینر مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ساری تفصیلات ۴۴ - ڈی ایم سی ایچ سوسائٹی کراچی کے پتے پر بھیجی جائیں۔

اقبال یوسف

بنیادی چیئرمین، پاکستان یوتھ لیگ - کراچی

نوٹ جمع کرانے والوں کے اعداد و شمار شائع کئے جائیں

۹ اور ۱۰ جون کی تاریخوں میں ملک بھر میں کتنے افراد نے ۱۰۰ اور ۵۰۰ روپے کے نوٹ جمع کرائے ہیں۔ اگر حکومت ان کی تفصیلات شائع کر دے تو اس سے پتہ چل جائے گا کہ ۱۲ کروڑ کی آبادی میں کتنے لوگوں کے پاس ۵۰۰ سو اور ۱۰۰ کے نوٹ تھے۔ ان اعداد و شمار سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ ان خوش نصیبوں کے علاوہ ملک بھر میں ایسے کتنے لوگ ہیں جن کے پاس سو روپے بھی نہیں ہیں۔ ان تفصیلات کے ساتھ ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی نقد پونجی کی تفصیلات بھی شائع کی جائیں۔ تاکہ عوام اپنی بدبختی کو واضح شکل میں دیکھ سکیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

سیّد ستار حسین - نیو کراچی

اُنہوں نے حکم دیا "میری تقریر مکمل چھپنی چاہیئے"! —— صفحہ ۱۴ سے آگے

بنی۔ شعیب حزیں صاحب نے مجھے لے جا کر اُن سے ملایا۔ سفارش کی کہ اگر یہ "امروز" میں بھرتی کے قابل ہو تو اِسے بھرتی کر لیا جائے۔ اُس وقت مجھے تجربہ تو تھا نہیں ترجمہ واجبی سا آتا تھا۔ اور پھر خبر کا ترجمہ تو خاصا ٹیکنیکل کام ہے وہ بغیر ریاضت کے کیسے آتا۔ مراد شعیب صاحب کی یہ تھی کہ آدمی شریف ہے اسے راستہ پر لگا دیا جائے تو چل نکلے گا۔ پہلے تو مولانا حسرت نے سگریٹ کا بڑا گمبھیر کش لگایا اور پھر کہنے لگے "مولانا یہ آپ غزل وزل کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہو؟" میں نے جواب دیا "اس لئے کہ آپ بھی غزل کہتے ہیں" بولے "میں اب تائب ہو گیا ہوں" لیکن مُنہ سے لگی ہُوئی کافر چھُٹتے چھُٹتے ہی چھُٹے گی"

یہ میری حسرت صاحب سے پہلی مُلاقات تھی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے "نو سکھیے" کی حیثیت سے اخبار میں بھرتی کر لیا گیا۔ ترجمے کی مشق اور رفتار صفر تھی۔ بہر حال جی کڑا کر کے ہفتہ دس روز کے اندر تھوڑی بہت مشق بہم پہنچا لی۔

اس وقت مجھے بتایا گیا کہ امپیریلزم کا ترجمہ "شہنشاہیت" نہیں ہوتا، سامراج لکھنا چاہیئے۔ اور "امپیریلسٹ" کے معنی ہوتے ہیں سامراجی۔ شہنشاہیت پسند نہیں۔ حمید کاشمیری (مرحوم) اُس دَور میں نائب شفٹ انچارج ہُوا کرتے تھے، اور ڈے شفٹ میں احمد ریاض اور احمد بشیر کام کرتے تھے (جو اب فلم "نیلا پربت" کے خالق تسلیم کئے جاتے ہیں) احمد بشیر بھی نئے نئے بھرتی ہُوئے تھے۔ لیکن حسرت انہیں بہت کس چکے تھے اس لئے وہ جلدی چل نکلے تھے۔

ابھی یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ مجھے تنخواہ کتنی ملے گی۔ اور مستقلاً دن کو کام کرنا ہو گا یا رات کو۔ اسی اثنا میں ضمیر جعفری جو حسرت صاحب کے دوست تھے اور انھیں اپنا مُرشد بھی مانتے تھے، اُن سے ملنے دفتر آئے۔ اُس وقت وہ کیپٹن ضمیر جعفری کہلاتے تھے، بعد میں میجر بنے۔ چہرہ اُن کا بھی ہر وقت گلنار رہتا تھا۔ وہ ایک روزنامہ کے ایڈیٹر بنائے گئے تھے، اور اُس کے لئے مشورہ کرنے حسرت صاحب کے پاس آئے تھے۔ حسرت صاحب نے احمد بشیر کے بھائی اختر کو اور مجھے ضمیر جعفری کے حوالے کر دیا۔ اور کہا کہ یہ نئے لڑکے ہیں مولانا، انہیں کام سیکھنے کا شوق ہے۔ ان سے کام لینا آپ کا کام ہے، جائیے

رام بھلی کرے گا" اور یوں میں باقاعدہ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک نئے اردو روزنامہ "غالب" میں پہنچ گیا جس کے چیف ایڈیٹر ضمیر جعفری ہی تھے۔ جو ہمیں امروز میں قدم جمانے سے پہلے ہی شکار کر کے لے گئے۔ (امروز میں کام کرنے کی حسرت سات آٹھ سال بعد کراچی میں پوری ہُوئی)

اب ذرا روزنامہ "غالب" کا حدود اربعہ سُن لیجیے

یہ اخبار پنجاب کی سیاسی توپ فیروز خان نون (مرحوم) کی سرپرستی میں نکلا تھا۔ اور اس دھوم دھام سے نکلا، جیسے یہ امروز کا بھٹہ بٹھا دے گا۔ مگر یہ خود چھ ماہ بعد بیٹھ گیا۔ غالب کا دفتر مال روڈ پر ایک ریستوران کے اوپر اُس جگہ تھا جہاں بعد میں روزنامہ آفاق کا دفتر قائم ہُوا "غالب" کے مینجنگ ڈائرکٹر سابق پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور، میاں احمد سعید تھے (پتہ نہیں وہ اب کہاں ہوں گے) جنھیں انگریزوں کے زمانے میں خان بہادر کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ جنرل مینجر میرے ہی ایک ہمنام محمد افضل خاں تھے جو کسی اخبار کے انتظام کا عملی تجربہ تو نہیں رکھتے تھے البتہ زمینداری کا انہیں تجربہ تھا۔ بڑے گھیر کی سفید شلوار اور سفید قمیض پہنتے تھے۔ سر پر جناح کیپ ضرور ہوتی تھی۔ اخبار کے مینجر کیسے بن گئے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ غالب میں ضمیر جعفری جیسی باغ و بہار

> **مولانا چراغ حسن حسرت نے کہا "اب میں غزل سے تائب ہو گیا ہُوں"**

شخصیت کی موجودگی کے باعث کافی لطف میں وقت کٹا۔ اور یہ احساس بھی نہ ہُوا کہ نوکری کر رہا ہوں۔ یہ احساس اُس وقت ہُوا جب اخبار ملازموں کی چار چار ماہ کی تنخواہیں دبا کر ڈوب گیا۔ کل چھ ماہ اُس کی زندگی کی مدت تھی۔ گویا صرف دو ماہ تک ہمیں پابندی سے تنخواہ ملی۔ تنخواہ صرف ۹۰ روپے تھی لیکن اُس وقت کے نوّے روپے آج کل کے نو سو روپے کے برابر تھے۔ اس کا اندازہ اس وقت اچھی طرح سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں لاہور میں خالص دُودھ چار چھ آنے سیر اور دہی آٹھ آنے سیر تھا۔ اصلی گھی ساڑھے تین روپے سیر اور بکری کا گوشت ڈیڑھ روپے سیر تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نوّے روپے ماہوار تنخواہ کافی تھی۔ اور ایک اخبار میں باضابطہ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے نوّے روپے پا کر جو مسرّت اور اطمینان حاصل ہُوا وہ بعد میں ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ پا کر بھی نصیب نہ ہو سکا۔

روزنامہ غالب میں میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے تھے وہ سب مجھ سے پیشے میں سینیئر تھے۔ ان میں نظیر لدھیانوی، فیض انبالوی، شبلی بی کام (جواب ایم کام ہیں) شمس ملک شامل ہیں۔ حسرت صاحب چونکہ ضمیر جعفری کے مرشد تھے اس لئے "طرزِ بیدل میں ریختے" والی بات، امروز سے نکل غالب میں بھی در آئی۔ وہی چوکھٹے، وُہی نسخ میں سرخیاں اور ڈبل کالمی سکالمی خبر کا انٹرو یا خلاصہ ابتدائی چار چھ سطروں میں لکھنے کا چلن امروز ہی سے غالب میں پہلی بار استعمال ہُوا۔ پرچے کا چہرہ مُہرہ بھی امروز ہی سے مِلتا جُلتا تھا۔

پنجاب کی محلاّتی سیاست کے تین بڑے ستون تھے۔ نواب ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خاں نون۔ اخبار "نوائے وقت" واقعی وقت کی آواز تھا۔ ممدوٹ کی وزارت ہو تو ممدوٹ صاحب کے ساتھ، اور دولتانہ وزیر اعلیٰ کی گدی پر بیٹھیں تو ان کی ہمنوائی اس کا فرض۔ لیکن فیروز خاں نون کا کبھی اس اخبار نے ساتھ نہیں دیا۔ میاں افتخار الدین امروز اور پاکستان ٹائمز نکال رہے تھے۔ اور وہ اس گروپ کی سیاست میں فٹ بیٹھتے ہی نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ اپوزیشن میں رہے اور عوام کی طرف سے حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کو انہوں نے ہمیشہ اپنا فرض جانا۔ لے دے کر فیروز خاں نون رہ گئے تھے جنھیں اپنے ایک ترجمان کی ضرورت کا احساس شدّت سے ستا رہا تھا۔ وہ بازیچۂ سیاست کے شاطر کھلاڑی تھے اور مات کھانا اپنی بے حد توہین سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عوام میں اپنا امیج بنائے بغیر بات نہیں بنے گی۔ اور امیج بنانے اور اُسے قائم رکھنے کے لئے کسی نہ کسی اخبار کا سہارا ضروری ہے۔ اخبار ہی کتنے تھے اور صرف

فیروز خاں نون کا اخبار ملازمین کی چار ماہ کی تنخواہیں لے کر ڈوب گیا

انہی کا ہمنوا کون بنتا۔ چنانچہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر انہوں نے خان بہادر میاں احمد سعید سے ایک اخبار نکالنے کے بارے میں صلاح مشورہ کیا اور غالب لمیٹڈ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ کی بنیاد پڑ گئی۔ روزنامہ "غالب" اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہُوا۔ فیروز خاں نون غالب لمیٹڈ کے چیئرمین اور میاں احمد سعید مینجنگ ڈائریکٹر قرار پائے۔ کئی روز پہلے سے اخبار کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ بڑے بڑے پوسٹر چھپے اور اخباروں میں اشتہار بھی چھپوائے گئے۔ ضمیر جعفری کی خدمات حاصل کی گئیں اور انہوں نے ایڈیٹر کی حیثیت سے عملہ کی بھرتی شروع کر دی۔ اسی ریلے میں مَیں بھی بہتا ہُوا آ گیا۔

اخبار کی کوئی افتتاحی تقریب منعقد نہیں ہُوئی۔ اور نہ فیروز خاں نون کبھی اخبار کے دفتر آتے جو عملہ کو اُن سے تعارف کا شرف حاصل ہوتا۔ پتہ چلا کہ مصلحت اس میں یہ ہے کہ وہ خود روزنامہ غالب سے کسی حیثیت سے بھی واسطہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور نہ ابتدائی مرحلہ پر وہ اس راز کو الم نشرح کرنا چاہتے ہیں کہ اخبار انہوں نے نکالا ہے۔ عام لوگوں کو نہ سہی خواص کو تو بہر حال معلوم ہو ہی گیا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے' سہ پہر کے چار بجے ہوں گے کہ عملہ کو اطلاع ملی کہ نون صاحب دفتر کے نیچے گاڑی میں بیٹھے ہیں اور چند لمحوں بعد اُوپر آ کر سب سے ملیں گے۔ یہ افواہ پھیلتے چپراسی سے لے کر جنرل مینجر تک سب حرکت میں آ گئے۔ ایڈیٹر صاحب اُس وقت موجود نہیں تھے۔ ورنہ شاید وہ خود دوڑے ہُوئے نیچے جاتے مگر ان کی بجائے جنرل مینجر افضل خاں نون صاحب کے پاس لپکے ہُوئے پہنچے اور تھوڑی ہی دیر میں بھاگے ہُوئے اُوپر آئے کہنے لگے کہ رپورٹر اختر کہاں ہیں۔ اختر اُس وقت آتے نہیں تھے تو مجھ سے فرمانے لگے کہ "چلو میاں اُٹھو' کاغذ قلم لو اور نون صاحب کے ساتھ گورنمنٹ کالج چلے جاؤ۔ وہ ایک مباحثہ کی صدارت کریں گے۔ اس تقریب کا حال اور نون صاحب کی تقریر اگر وہ کریں تو نوٹ کر کے لے آنا۔"

رپورٹنگ سے میرا کیا واسطہ۔ نہ مجھے یہ پتا تھا کہ رپورٹر کو کہیں جانے کے بعد کیا کچھ کرنا ہوتا ہے۔ خیر میں پھولے ہُوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ نیچے آیا۔ مینجر صاحب بھی میرے ساتھ آئے اور انہوں نے کار کا آگے کا دروازہ کھولا کہ میں آگے کی نشست پر بیٹھ جاؤں۔ پچھلی سیٹ پر فیروز خاں نون سُوٹ پہنے بیٹھے تھے۔ چشمے میں سے آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا اور اشارہ کیا کہ میں آگے بیٹھنے کی بجائے اُن کے ساتھ بیٹھوں۔ جنرل مینجر خفیف سے ہو کر رہ گئے اور میں انتہائی انکساری کے ساتھ سمٹ کر پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور کار مال روڈ سے گورنمنٹ کالج کی طرف چل پڑی۔ میں نون صاحب سے گفتگو کا پیرایہ آغاز ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ انہوں نے خود ہی مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔

"آپ رپورٹر ہیں؟"

"جی نہیں —— میں سب ایڈیٹر ہوں۔ اس وقت دفتر

بقیہ :- کرکٹ

دوسری اننگ میں ۹۴ رنز پر چار بیٹسمینوں کا جلوس نکال دیا۔ اگر کھیل جاری رہتا تو شاید وہ برطانیہ کے کھلاڑیوں میں مزید تباہی پھیلاتا۔ مگر وہ قدرت سے مقابلہ نہ کر سکا۔ جو اچانک برطانیہ کی امداد کو پہنچ گئی

میرا مطلب اس بارش سے ہے جس نے فتح پہ ڈاکہ ڈال دیا۔ برطانیہ میں پاکستانی کھلاڑیوں کے عمدہ کھیل پر ہر پاکستانی کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا کہ اچانک دو افسوسناک خبریں موصول ہوئیں۔ سعید اور سرفراز ٹیم چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرا یہ کہ فنڈ کی کمی کی وجہ سے ہمارے کھلاڑی چھلی اور چپس پہ گذارا کر رہے تھے۔ حکومت نے اس پر فوری قدم اُٹھایا اور ۲۵ ہزار روپے منظور کئے گئے مگر سعید اور سرفراز کے مسئلے پہ ہنوز پردہ پڑا ہُوا۔

سرفراز اپنی چوٹ کا علاج کرانے کے لئے نارتھمپٹن چلے گئے۔ اور سعید کو پہلے ٹیسٹ میں کھلایا نہیں گیا جبکہ ٹسٹ کے دوران وہ اپنی بیوی کے ساتھ لندن میں موجود تھے۔ سعید ایک پرانے اور تجربہ کار کھلاڑی ہیں۔ انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔

انہیں ۱۹۶۶ء میں انگلینڈ کے مقابلے میں پاکستانی ٹیم کا کپتان بنایا گیا تھا لیکن دُوسرے سال جب نیوزی لینڈ کی ٹیم پاکستان کے دَورے پہ آئی تو انھیں کپتان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ سعید نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا جس کی پاداش میں انھیں ایک سال کے لئے کھیل سے معطل کر دیا گیا۔

جہاں تک میرا علم ہے سعید نے ہر قسم کے حالات میں نظم و ضبط کی پوری پوری پابندی کی ہے تاکہ آنے والے نوجوان اُن کے نقش قدم پر چل سکیں۔ حقیقت کو دیکھئے، وہ سب سے سینیئر کرکٹیئر ہیں لیکن انھوں نے سب سے جونیئر کرکٹیئر جاوید برکی کی کمان میں کرکٹ کھیلا۔ جاوید برکی کو ۱۹۶۲ء میں اچانک کپتان بنا دیا گیا تھا

بقیہ :- زندگی اے زندگی

میں شامل نہیں۔ جس مہینے میں آمدنی کم ہوتی ہے اس مہینے وہ بناسپتی گھی نہیں خریدتا۔ مہینے میں ایک بار فلم اور سائیکل کی مرمت پر اُسکے ہر ماہ کم از کم گیارہ بارہ روپے خرچ آتے ہیں۔ آمدنی کے مطابق اُسے ہر ماہ اپنے ضروری اخراجات گھٹانے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی تو تنگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بچے کے دُودھ میں بھی کمی کرنی پڑتی ہے۔ سال میں ایک مرتبہ کپڑے کی ایک جوڑی اور معمولی قسم کا جُوتا اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پورا سال اس میں پیوند لگا لگا کر گذر بسر کرتا ہے۔

مہینے میں چند دن نکال کر ۵ روپے روز کے حساب سے اُس کی ماہانہ آمدنی زیادہ سے زیادہ ۱۳۵ روپے ہوتی ہے' جب کہ روزانہ اخراجات کے حساب سے اسے ہر ماہ زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ روپے تک خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس زائد اخراجات کو پورا کرنے کے لئے وہ زیادہ بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ بعض دنوں میں فاقہ بھی کرنا پڑتا ہے اور چند دن سوکھی روٹی اور ٹھنڈے پر کام چلانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اس شہر میں ایسے رئیس زادوں کی کمی نہیں جو اپنے چونچلوں پر روزانہ ۱۰ روپے سے لے کر ۲۰ روپے تک خرچ کر دیتے ہیں۔ مہنگائی میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے' اشیائے صرف کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ بجٹ کا اعلان ہونے والا ہے۔ بیشتر چیزوں پر ساٹھ سے لیکر ۸۰ فیصدی تک قیمتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ اگر اس بار بھی ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا گیا تو بیشتر ضروری اور بنیادی چیزیں عام آدمی کے دسترس سے باہر ہوں گی۔ رحیم بخش اور اُس جیسے لاکھوں، کروڑوں مزدوروں کے لئے زندگی ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائے گی۔

کوئی رپورٹر موجود نہیں تھا اس لئے یہ خدمت مجھے سونپ دی گئی۔"

"اچھا اچھا"

اور پھر ملک فیروز خاں نون مجھے بتانے لگے کہ مجھے اس تقریب کو کس طرح کور کرنا ہے اور خاص طور پر اس پر زور دیا کہ میں اُن کی تقریر توجہ سے سُنوں اور نوٹ کروں، اور اخبار میں پوری تقریر لکھ کر دوں۔ اُن کی تقریر لکھی ہُوئی نہیں تھی البتہ مجھے نکات الگ کاغذ پر انہوں نے لکھ دیئے تھے، اور اُسی کاغذ کو سامنے رکھ کر انھوں نے تقریر کی تھی۔ انگریزی مباحثہ کا موضوع تھا۔ "جمہوریت کے بغیر قومی ترقی و خوشحالی ممکن نہیں" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مباحثہ کے اختتام پر ملک فیروز خاں نون نے جو تقریر کی تھی اس میں واضح طور پر اس کا ذکر کیا تھا، اور بار بار اس پر زور دیا تھا کہ جمہوریت کے بغیر نہ صرف ترقی و خوشحالی ممکن نہیں بلکہ کسی ملک کا وجود ہی بے معنی ہے۔ جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہ ملے تو ملک کا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے اور پھر انہوں نے کئی مثالیں بھی دی تھیں۔ یہ تقریر میں نے خوب احتیاط اور ہوشیاری سے نوٹ کی تھی۔ اور کوئی اہم نکتہ ایسا نہیں تھا جو نوٹ کرنے سے رہ گیا ہو۔

تقریب کے اختتام پر نون صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ میں نے تقریر کے تمام اہم نکات نوٹ کر لئے ہیں یا نہیں۔ اور پھر کہنے لگے کہ "خیال رکھنا، پوری تقریر چھپنی چاہیئے۔" میں نے اُنھیں مزید اطمینان اور یقین دلا دیا کہ اُن کی ہدایت پر پوری طرح عمل ہوگا۔ پھر انہوں نے ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ "اِنھیں دفتر چھوڑ آؤ۔" نون صاحب کو اپنی بیگم کا انتظار تھا جو کسی اور تقریب سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج پہنچنے والی تھیں۔

میں نے دفتر پہنچ کر مباحثہ کے نتائج اور نون صاحب کی تقریر کی خبر مفصل بنا کر شفٹ انچارج فیض انبالوی کو دیدی۔ اور اُسے بتا دیا کہ یہ خبر پوری چھپنی ہے۔ نون صاحب کا حکم اور تاکید ہے۔ انہوں نے خبر دیکھ کر شعبۂ کتابت میں لکھنے کو بھیجدی۔ رات کو دس بجے نون صاحب کا فون آیا کہ میں نے اُن کی تقریر کی خبر بنالی ہو تو لے کر اُن کی کوٹھی پر حاضر ہو جاؤں۔ میں نے عرض کیا "آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ خبر پہلے آپ کو دکھا دی جائے۔ وہ خبر میں نے تفصیل سے تیار کر دی تھی اور کتابت ہونے کے بعد اندر کی کاپی میں لگ کر چھپنے بھی چلی گئی۔ البتہ انٹرو پہلے صفحہ کے لئے روک لیا ہے۔ وہ میں لے کر حاضر ہوا چاہتا ہوں"

یہ سُننا تھا کہ نون صاحب غُصّہ سے بپھر گئے۔ مگر پھر اچانک انھیں احساس ہُوا کہ واقعی انھوں نے چھاپنے سے پہلے خبر دکھانے کی ہدایت نہیں کی تھی چنانچہ میری جان بخشی ہو گئی۔ اور انہوں نے مجھے حاضر ہونے کی زحمت دینے کی بجائے ٹیلیفون ہی پر خبر کا انٹرو سنانے کو کہا۔ انٹرو مختصر تھا اور خبر کے آخر میں لکھ دیا گیا تھا کہ مفصل خبر صفحہ فلاں پر دیکھیئے۔

نون صاحب کہنے لگے "میں نے پُوری تقریر میں بہت کچھ کہا تھا۔ یہ تو بہت ادھوری خبر ہے۔"

میں نے انھیں سمجھانے کی بہتری کوشش کی کہ اندر کے صفحہ پر دو کالم کی خبر چھپ رہی ہے جنوادل پر اس کا حوالہ موجود ہے، مگر وہ مطمئن نہیں ہُوئے۔ دُوسرے دن انہوں نے ضمیر جعفری صاحب کو ایک نوٹ بھجوایا جس میں لکھا تھا کہ "آپ نے میری خبر کے ساتھ انصاف نہ کر کے مجھے خوش نہیں کیا۔"

ضمیر جعفری صاحب نے مجھ سے جواب طلب کیا۔ میں نے ساری حقیقت کہہ سُنائی۔ وہ کہنے لگے "واہ صاحب اچھا مذاق ہے۔ ہم کسی کو خوش کرنے یا ناراض کرنے کے لئے اخبار نکالتے ہیں کیا؟"

میں جب اُس روز کام ختم کر کے گھر گیا تو یقین تھا کہ دُوسرے دن مجھے چلتا کر دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہُوا۔ دُوسرے دن دفتر پہنچ کر پتہ چلا کہ نون صاحب نے ضمیر جعفری صاحب سے فون پر کہا ہے کہ "میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔"

ملک فیروز خاں نون کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ چونکہ اپنی خبر کے ساتھ بدسلوکی پر اظہارِ برہمی کر چکے ہیں اس لئے دفتر کی انتظامیہ اُن کی خوشنودی کی خاطر مجھے ملازمت سے جواب دے دے گی۔ اس لئے انہیں بطور خاص چیف ایڈیٹر کو فون پر ہدایت دینی پڑی۔

اچھے اور نیک خاندان کا آدمی ہو تو کبھی کمینگی کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا۔ میں فیروز خاں نون کو اس لئے نہیں بھول سکوں گا کہ وہ بڑے اور فراخدل انسان تھے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ اپنی تقریر کا متن صفحۂ اوّل پہ کیوں چھپوانے پر مصر تھے تو میرے خیال میں اگر فطری کمزوری نہ ہو تو انسان منصبِ پیغمبری پر متمکن ہو جائے۔

بقیہ: سرورق کی کہانی

چار بے گناہ انسانوں کے قاتل کو کس رنگ میں پیش کر دیا۔

ایک مسلمان اور وہ بھی سچا مسلمان

اس طرح بات یوں بنتی ہے کہ سچا مسلمان وُہی ہے جو دُوسرے عقائد رکھنے والوں کو مار ڈالے۔ اس کے علاوہ اُسے ذہنی عدم توازن کا شکار بھی بتایا گیا ہے۔ حالانکہ عدالت نے اُسے صحیح الدماغ قرار دے دیا تھا۔ روزنامہ جسارت کا اداریہ قابلِ اعتراض ہی نہیں بلکہ انصاف اور قانون کے نزدیک ایک سنگین جُرم ہے۔

روزنامہ جسارت میں فیروز عبداللہ کی جو خبریں شائع ہُوئی ہیں اُس کی رپورٹنگ بھی قابلِ مواخذہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"دُنیا بھر میں تہلکہ مچانے والے فیروز عبداللہ کو آج نمازِ ظہر کے بعد انتہائی خاموشی سے ملبرسٹی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس کے بھائیوں اور ماموں کی آنکھ سے اشکوں کا سیل رواں تھا۔ صدمے کی وجہ سے وہ بالکل گم سُم تھے۔"

اس کے علاوہ صفحۂ اوّل پر ایک بکس، "بدلتا ہے رنگ آسماں" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔

"سب سے حیرت انگیز اور نمایاں بات یہ تھی کہ جنازے میں فیروز عبداللہ کے پی آئی اے کے کسی دوست ساتھی یا ڈرائیور نے شرکت نہ کی"

فیروز عبداللہ جیسے بھیانک جرم کرنے والے مجرم سے روزنامہ جسارت کی اظہارِ ہمدردی خالی از علّت نہیں۔ اس اخبار کو فیروز عبداللہ سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے۔ اس کی یتیم بچیوں پر تو وہ اداریہ سپردِ قلم کر سکتا ہے مگر چار بے گناہ افراد کی ہلاکت اور ان کے یتیم بچوں اور بیواؤں کے لئے اظہارِ ہمدردی میں ایک لفظ محض اس لئے ادا نہیں کر سکتا کہ مرنے والے فیروز عبداللہ کی طرح مذہبی جنون میں مبتلا نہ تھے۔ وہ لفظ "مومن" کے کھینچے ہُوئے دائرے میں نہیں آتے تھے۔ جس دائرے میں وہ چاقو لہراتے ہوئے گھوم رہا تھا۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
17-24 JUNE, 1971